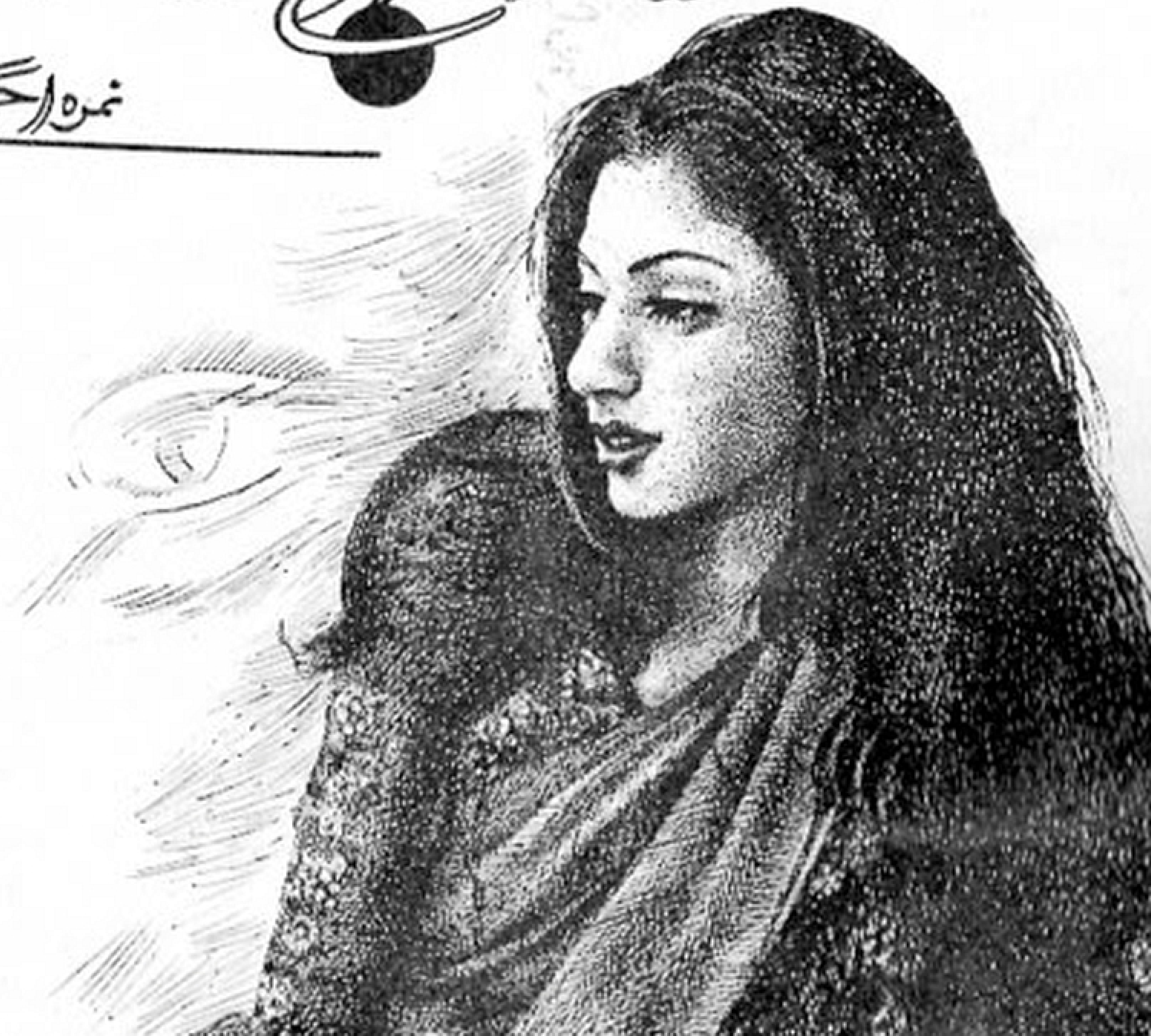
میرے خواب میرے جگنو

نمرہ احمد



شوفر نے حیرت سے بیک ویو مرر میں اس کا چہرہ دیکھا جو لاتعلق سا بیٹھا سڑک پر چلنے والی ٹریفک کو دیکھ رہا تھا۔ اس نے گلا کھنکھار کر پیچھے بیٹھے اپنے باس کو متوجہ کرنا چاہا مگر وہ بدستور کھڑکی سے باہر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

"سر!" شوفر نے اسے مخاطب کیا۔

اس نے دھیرے سے چہرہ اس کی طرف کیا۔ اس کو لگا اس نے اپنے باس کو کسی گہری سوچ سے نکال کر ڈسٹرب کر دیا ہے۔

"سر! دوسرے روٹ سے نکالوں یا اسی راستے سے چلوں؟" اس کو متوجہ پا کر شوفر سیموئیل جلدی جلدی بتانے لگا۔ "دراصل یہاں ٹریفک جام ہو گیا ہے۔ اگر آپ کہیں تو میں گاڑی دوسری طرف ڈال دوں۔ ٹائم ویسٹ نہیں ہو گا۔"

کچھ دیر وہ خالی نگاہوں سے سیموئیل کا چہرہ تکتا رہا، پھر شانے اچکا دیے "ایز یو وش" اتنا کہہ کر وہ دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

سیموئیل نے بیک ویو مرر میں نہایت حیرت سے اسے دیکھا۔ کہاں وہ اتنا وقت کا پابند کہ تیس سیکنڈ کی تاخیر پر بھی جھاڑ پلا دیتا، کبھی اگر وہ ازراہِ مجبوری گاڑی روک بھی دیتا تو وہ وجہ جاننے کے باوجود بھی اس بے چارے کو اتنی قہر آلود نظروں سے گھورتا کہ وہ خوامخواہ ہی شرمندہ ہو جاتا اور کہاں کہ اسے وقت مقررہ پر ہوٹل پہنچنے کی کوئی جلدی نہ تھی۔ اسے اتنا بھی احساس نہ تھا کہ ٹریفک میں پھنس کر وہ پہلے ہی قیمتی تیس منٹ ضائع کر چکے ہیں۔ سیموئیل نے شانے اچکائے اور اسٹیئرنگ پر رکھے اپنے سرخ ہاتھ قدرے ڈھیلے چھوڑ دیے۔

سیموئیل کو اس شخص کی نوکری کرتے ڈھائی برس ہو گئے تھے۔ ان ڈھائی برسوں میں جب بھی وہ اس شہر میں آتا اس کو ایئرپورٹ سے ہوٹل اور ہوٹل سے آفس لے کر جانا اسی کے ذمے تھا۔ اس کو اپنے باس سے سوائے اس کے کوئی شکوہ نہ تھا کہ وہ وقت کا بہت پابند ہے۔ وہ ایک سیکنڈ کی دیر بھی نہیں برداشت کرتا تھا۔ اک دفعہ سیموئیل نے اس سے پوچھ ہی لیا کہ "آپ اتنے پنکچوئل کیسے ہیں؟"

جواب میں اس نے کچھ حیران سا ہو کر اسے دیکھا تھا۔

"تمہیں پتا ہے مجھے کیا چیز تکلیف دیتی ہے؟"

سیموئیل کے نفی میں سر ہلانے پر وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔

مکمل ناول

"مجھے صرف یہ بات تکلیف دیتی ہے کہ دن بارہ گھنٹے کے بجائے چوبیس گھنٹے کا کیوں نہیں ہوتا۔"

اس نے پوری آنکھیں کھول کر اسے دیکھا تھا اور پھر نہ سمجھتے ہوئے بھی سر ہلا دیا۔ اس روز اسے اپنا باس بہت عجیب لگا تھا۔ اسٹاف کے دوسرے لوگوں کو اس نے اکثر یہ کہتے ہوئے سنا تھا کہ "یہ انسان نہیں مشین ہے۔"

اور اس کے ساتھ سیموئیل جب بھی کوئی دن گزارتا، اسے یقین ہو جاتا کہ وہ واقعی مشین ہے۔ اس نے اتنا محنتی شخص آج تک نہیں دیکھا تھا۔ وہ جب گاڑی میں ہوتا تو بھی کام ہی کرتا رہتا۔ کبھی فائلز دیکھ رہا ہے تو کبھی لیپ ٹاپ پر بزی ہے۔

مگر آج تو لگتا تھا اس نے سموئیل کو حیران کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ جب وہ اسے لینے ایرپورٹ پہنچا تھا تو پورے دس منٹ کی ناقابل تلافی تاخیر سے آیا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ آج اسے سخت قسم کی ڈانٹ پڑے گی، مگر اس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب کچھ کہنا تو در کنار اس کے باس نے اسے غصے سے گھورا بھی نہیں تھا۔ پہلے کی طرح آج اس نے بال موز سے پیچھے نہیں کیے تھے، بلکہ کنگھی بھی برائے نام ہی کی تھی۔ اس نے آج ٹائی بھی نہیں باندھی تھی۔ اور شاید ٹھیک سے شیو بھی نہیں کی تھی۔ اپنے حلیے کی طرح وہ خود بھی بہت الجھا الجھا اور مضمحل سا لگ رہا تھا۔

جب وہ گاڑی میں بیٹھا تھا تو اس کے پوچھنے پر کہ کہاں جانا ہے، وہ بہت تھکے تھکے لہجے میں بولا۔ "جسٹ ڈرائیو اراؤنڈ!" سیموئیل کو بتایا گیا تھا کہ اس کی یہاں کوئی میٹنگ ہے "لیکن اگر ایسا ہے بھی تو وہ اس کو مقررہ جگہ پر چلنے کا کیوں نہیں کہہ رہا؟" سیموئیل نے حیرانی سے سوچا۔

حیرت کا دوسرا جھٹکا اسے تب لگا تھا جب اس نے بیک ویو مرر میں اپنے ہینڈسم باس کو سر سیٹ کی پشت سے ٹکائے آنکھیں موندے دیکھا تھا۔ اس کا بریف کیس ساتھ والی سیٹ پر دھرا تھا مگر آج وہ نہ تو کوئی فائلیں دیکھ رہا تھا نہ ہی لیپ ٹاپ پر مصروف تھا۔

ان کو یونہی سفر کرتے چالیس منٹ گزر چکے تھے جب اس کے باس نے اچانک ہی کہہ دیا۔

"ہائیڈ پارک لے چلو۔"

سیموئیل کو اندازہ تھا کہ اس کے باس کی کوئی بھی میٹنگ ہائیڈ پارک میں نہیں ہو سکتی مگر وہ بغیر کسی استفسار کے ہائیڈ پارک کے سامنے لے جا کر گاڑی روک دی۔ اس کے اترنے سے پہلے ہی وہ پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر باہر نکل چکا تھا۔ مگر باہر جا کر وہ پارک کے اندر نہیں گیا بلکہ یونہی سیاہ رنگ کے جنگلے کے پاس کھڑا ہو گیا۔

اس کے پیچھے سیموئیل بھی گاڑی سے نکل آیا وہ اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔ اسے لگا کہ اس کے باس نے اسے مخاطب کیا ہے۔

"سیم!" وہ نگاہیں پارک کے اندر لگے سبزے پر جمائے اس سے کہہ رہا تھا "وہ بھی ایسا ہی ایک پارک تھا۔" وہ ہمیشہ اس کو البرائیٹ کہہ کر پکارتا تھا۔

"جی؟" سیموئیل کو اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔

"وہ بھی ایسا ہی ایک پارک تھا۔ جہاں میں اس سے پہلی دفعہ ملا تھا۔" اس کی دھیمی آواز سیموئیل کو بمشکل سنائی دی۔ اس نے خواہ مخواہ ہی سر ہلا دیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"چلو!" اس نے چونک کر اپنے باس کی جانب دیکھا جس کے لہجے میں یہ کہتے ہوئے ذرہ برابر بھی تحکم نہ تھا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ بولا۔

"میریٹ چلنا ہے۔" اس مختصر حکم پر سیموئیل کے دل کو تسلی ہو گئی کہ باس کو اپنی میٹنگ یاد تھی۔

چونکہ باس نے فیصلے کا اختیار اس کو دے دیا تھا، اسی لیے وہ بہت آرام سے اسی راستے سے گاڑی دوڑاتا ہوا ہوٹل میریٹ لے آیا۔ گاڑی روکتے ہی پھرتی سے نیچے اتر کر اس نے اپنے باس کے لیے دروازہ کھولا۔

وہ آرام سے نیچے اترا اور سیموئیل سے بغیر کچھ کہے ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ آج وہ بہت آرام سے چل رہا تھا۔ اس سے پہلے وہ ہمیشہ لمبے لمبے ڈگ بھر کر چلتا تھا۔ مین ڈور کو "پش" کر کے کھولنے سے پہلے اسے گرے رنگ کے اس ہینڈل میں اپنا عکس نظر آ رہا تھا۔ صبح جب وہ ادھر آ رہا تھا تو بالوں میں انگلیاں پھیرنے کے علاوہ اس نے کچھ نہیں کیا تھا۔

اس کے بس میں ہوتا تو وہ منہ دھوئے بغیر ہی چلا آتا کیونکہ وہ جس سے ملنے آ رہا تھا، وہ اس قابل ہی نہیں تھی (اس کے نزدیک) کہ اس کے لیے تیار ہوا جاتا۔ شاید وہ اپنے اس اجڑے ہوئے حلیے سے ماہ نور جہانگیر کو یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ وہ اس کے لیے یہاں نہیں آیا۔ وہ صرف ایک خالص کاروباری کام کے سلسلے میں یہاں آیا تھا۔ یہ تو اتفاق تھا کہ ماہ نور "جہانگیر بلڈرز" کی چیئرپرسن تھی اور اس

کی اس میٹنگ میں شمولیت لازمی تھی ورنہ اگر یہ کوئی ذاتی نوعیت کی ملاقات ہوتی تو وہ اس جگہ ہرگز ہرگز نہ ہوتا۔

"ذاتی نوعیت کی ملاقات اور وہ بھی ماہ نور سے؟ ناممکن!" اس نے تنفر سے سر جھٹکا اور ریسپشنسٹ کی جانب دیکھنے کا تکلف کیے بغیر ہی لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ کسی کی طرف دیکھے بغیر اس نے لفٹ مین سے "ٹاپ فلور" کہا جس نے سر ہلا کر بارہ کا ہندسہ دبا دیا۔

جیسے جیسے لفٹ اوپر کی جانب بڑھ رہی تھی، وہ اپنے فیصلے پر پچھتا رہا تھا۔ صبح جب وہ اپنے ہیڈ آفس سے ایئرپورٹ کے لیے نکلا تھا، تب سے لے کر ہائیڈ پارک جانے تک وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرتا آیا تھا۔ کل رات سے اس کے ساتھ یہی ہو رہا تھا۔ وہ جو کرنا چاہتا تھا، اس سے الٹ ہو رہا تھا۔ وہ ایک نیم پاگل عورت کی بات مان کر ماہ نور سے ملنے نہیں آنا چاہتا تھا مگر پھر بھی وہ اس وقت وہاں موجود تھا۔

ہلکی سی دستک دینے کے بعد اس نے آرام سے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔

وہ اس آراستہ "سوئٹ" میں پہلی مرتبہ نہیں آ رہا تھا۔ اس کا خیال تھا ماہ نور وہاں پہلے سے موجود ہو گی کیونکہ یہ سوئٹ اسی نے بک کرایا تھا۔ مگر وہ اطراف میں کہیں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میٹنگ میں شامل تیسرے فریق کے متعلق اسے یقین تھا کہ بہت دیر سے آئے گا۔

"ایرانی کبھی وقت کی پابندی نہیں کر سکتے۔" اس نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے سوچا۔

وہ لونگ روم کا جائزہ لینے ہی لگا تھا کہ اس کی نگاہ خوب صورت بے بی پنک ہینڈ بیگ پر پڑی جو سنٹرل ٹیبل پر ٹی وی ریموٹ کے ساتھ پڑا تھا۔ اس ہینڈ بیگ کے وہاں ہونے سے صاف ظاہر تھا کہ ماہ نور جہانگیر پہنچ چکی ہے۔

☆ ☆ ☆

وہ اس کے آنے سے تقریباً" دس منٹ پہلے پہنچی تھی۔ وہ ابھی تک حیران تھی۔ اس کے تو خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ وہ واقعی کنٹریکٹ سائن کر کے اس کا پارٹنر بننے پر راضی ہو جائے گا۔ "ہو سکتا ہے وہ ڈیڈی کی وجہ سے ایسا کر رہا ہو۔" اس نے سوچا، ہو سکتا ہے اسے معلوم ہی نہ ہو کہ اب "جہانگیر بلڈرز" کی چیئرپرسن وہ ہے وہ سمجھا ہو کہ ابھی تک ڈیڈ اسے سنبھالتے ہیں اور ان کے دھوکے میں وہ مجھ سے ملنے آیا ہو۔ مگر ایسا ناممکن تھا، اس کے دماغ نے اس بات کی نفی کی تھی۔ اس کے یہاں آنے کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے کاروباری مفاد کے لیے اس کا پارٹنر بن رہا ہو۔ لیکن یہ بھی اصل وجہ نہ تھی کیونکہ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کا پارٹنر بن کر وہ رسک لے رہا تھا۔ فائدے سے زیادہ نقصان کا اندیشہ تھا۔

"پھر، پھر کیا وجہ ہے کہ یہ شخص اتنے عرصے بعد اس لڑکی سے ملنے آیا ہے۔ جس کی دنیا اندھیر کر کے وہ چلا گیا تھا؟ کیوں آیا ہے یہ اب؟ کیا مجھے یہ دکھانا چاہتا ہے کہ میرے بغیر بھی وہ بہت کچھ ہے؟ مگر میں نے تو ہرگز نہیں چاہا تھا کہ ہمارے درمیان اتنی دوریاں، اتنے فاصلے بڑھیں یہ سب کچھ تو اس نے چاہا تھا۔"

ان گزرے برسوں میں اس نے اخبارات و رسائل کے علاوہ صرف دو دفعہ اسے دیکھا تھا۔

ایک دفعہ تب جب وہ دبئی ڈیڈ کے آفس ان سے ملنے آیا تھا۔ اس وقت وہ لابی میں کھڑی تھی۔ وہ اسے بغیر دیکھے ہی گزر کر چلا گیا تھا۔ اس وقت وہ بہت حیران ہوئی تھی۔ کیونکہ اس کے خیال میں اس کا ڈیڈ سے کوئی تنازعہ چل رہا تھا۔

دوسری دفعہ تب جب وہ بڑے انہماک سے مانچسٹر یونائیٹڈ کا میچ دیکھنے آئی تھی اور وہ عماد کے ساتھ اسٹیڈیم میں بیٹھا تھا۔ وہ اس خود غرض اور لالچی انسان کو دیکھتے ہی وہاں سے اٹھ کر چلی آئی تھی۔ مگر اس سے پہلے..... اس سے کب ملی تھی وہ؟ اب تو اس بات کو کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ وہ ماضی کے دھندلکوں میں کھوئی ہوئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس نے ایک ناگواری سے بھرپور نگاہ خوب صورت عمارت پر ڈالی۔ "اتنا اولڈ فیشنڈ ہوٹل ملے گا رہنے کو؟" وہ نخوت سے سوچنے لگی۔

سفید نرم نرم چاندی سے ڈھکا مالم جبہ، ماہ نور جہانگیر کی توقعات پر پورا نہیں اترا تھا۔

ہوٹل کو باہر سے دیکھ کر ہی اس کا دل ایک دم اچاٹ سا ہو گیا تھا۔ وہ ایک ہفتے کے ٹور پر آئی تھی مگر اس شہر کو دیکھ کر اس نے اپنے ٹور میں سے چار دن کم کر دیے تھے۔

ماہ نور اس وقت کو کوس رہی تھی جب وہ اپنے والد جہانگیر صاحب کا مشورہ مان کر ادھر آ گئی تھی۔ اس بات کو دو روز ہی گزرے تھے۔

ایک دن وہ ڈنر پر موجود تھے جس کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے جہانگیر صاحب کے سامنے اپنا مدعا رکھ دیا تھا۔

"ڈیڈ! میں اس دفعہ اسکائنگ کرنے کسی نئی جگہ پر جانا چاہتی ہوں۔"

"تم ہر سال جاتی ہو ماہ نور! اس سال اپنی پڑھائی پر توجہ دے دو تو بہتر ہوگا۔" وہ نرمی سے بولے۔

"میں نے مشورہ مانگا تھا۔" اس نے ناک چڑھائی "آپ تو لیکچر دینا شروع ہو گئے ہیں۔"

کھانا کھاتی سمل نے ایک لمحے کو سر اٹھا کر اس کی طرف اور پھر باپ کی طرف دیکھا' جو ماہ نور کو دیکھ رہے تھے۔ سمل سر جھکا کر دوبارہ کھانے میں مصروف ہو گئی۔

"نور! میں تمہاری اسٹڈیز کے بارے میں کنسرنڈ ہوں بیٹا!" وہ پیار سے بولے مبادا اس کا موڈ ہی بگڑ جائے۔

"وہ تو ہوتی رہے گی ڈیڈ۔ مگر ابھی تو چھٹیاں ہیں۔" وہ لاڈ سے بولی۔

"اچھا!" وہ ہمیشہ کی طرح ماہ نور کے آگے ہار مان گئے تھے "تو تم الاسکا چلی جاؤ۔"

"میں بور ہو چکی ہوں' الاسکا سے" اس کی خوب صورت پیشانی پر بل پڑ گئے تھے۔

"ایک نئی جگہ ہے وہاں اسکائنگ اتنی خاص تو نہیں ہوتی مگر گھوم پھر لینا۔"

"کدھر؟" وہ اشتیاق سے بولی۔

"مالم جبہ"

"وہ کہاں ہے؟" وہ لاپروائی سے پوچھنے لگی۔

سمل نے ایک دفعہ پھر سر اٹھا کر ماہ نور اور جہانگیر صاحب کو دیکھا۔

"یہیں پاکستان میں ہے" جہانگیر نے بتایا تو سمل دوبارہ کھانے میں مصروف ہو گئی۔

"اچھا؟" ماہ نور حیران ہوئی۔

اب اسے اپنے آپ پر افسوس ہو رہا تھا کہ وہ کیوں جہانگیر کی بات مانتے ہوئے ادھر چلی آئی تھی۔ نہایت ڈپریس ہو کر اس نے اپنے ٹور کا مزید ایک دن کم کر دیا۔

یہ مالم جبہ آنے کے دوسرے دن کی بات ہے۔ وہ لنچ کرنے ریسٹورنٹ کی طرف جا رہی تھی کہ راہداری میں سے گزرتے ہوئے اس نے اسے دیکھا۔ ماہ نور کے حسین لبوں سے بے اختیار "واؤ" نکلا تھا۔ وہ سامنے سے چلا آ رہا تھا۔ اس نے اتنا خوب صورت اور وجیہہ مرد آج تک نہیں دیکھا تھا۔

وہ تیز تیز چلتا ہوا اس کے قریب آ گیا اور پھر ایک طرف سے نکل کر چلا گیا۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا کہ کوئی ماہ نور کو دیکھے اور رک کر دوبارہ نہ دیکھے اور اس کے حسن کی تعریف نہ کرے۔ نجانے کیوں اس نے ماہ نور کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ وہ شکل سے بہت مغرور لگتا تھا۔ شاید اسے اپنی وجاہت پر حد سے زیادہ غرور تھا یا پھر وہ اندھا تھا۔

اس کو دیکھ کر ماہ نور کے دماغ کے کسی گوشے میں ایک شبیہہ ابھری تھی۔ جسے وہ کوئی نام نہ دے سکی۔ اسے نجانے کیوں ایسا لگا کہ اس نے اس شخص کو پہلے کہیں دیکھا ہے۔ ادھر وہ سوچ رہا تھا۔

"اوہ یو شٹ اپ!" کسی نے بہت زہریلے لہجے میں ایک دفعہ اس سے کہا تھا۔ کس نے' کب اور کہاں یہ بات کی تھی' اس کو یاد نہ تھا۔

اس نے ایک لمحے کو پیچھے مڑ کر ماہ نور کی جانب دیکھا۔ وہ جا چکی تھی۔ اس نے جلدی سے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر آ کر بستر پر ڈھے سا گیا۔

"اگر اس نے مجھے پہچان لیا اور کسی سے کچھ کہہ دیا تو؟" اس سے آگے وہ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کو کسی رسوائی یا تضحیک کا ڈر نہ تھا۔ وہ صرف اس بات سے خائف تھا کہ اگر ماہ نور نے اسے پہچان لیا اور اسے پچھلی ملاقات کا کوئی حوالہ دے کر اپنی پہچان کرانے کی کوشش کی تو اس کا سارے کا سارا پلان دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ وہ اپنے انتقام کا منصوبہ خاک میں مل جانے سے ڈرتا تھا۔

"شاید اس کو میں یاد نہ ہوں" اس نے سوچا' پانچ' ساڑھے پانچ برس پرانی بات کون یاد رکھتا ہے؟

☆ ☆ ☆

وہ صبح جلدی اٹھنے کی عادی نہ تھی مگر اس صبح کو وہ بہت جلدی اٹھ گئی تھی۔ تقریباً پانچ منٹ بعد وہ باہر تھی۔

"اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں یہاں بیٹھ جاؤں؟" ماہ نور نے اپنے مخصوص شوخ لہجے میں پوچھا۔

وہ ایک دم چونک پڑا اور سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔

"جی؟"

"یہ کون سا میرے باپ کی جاگیر ہے۔ آپ کا جہاں جی چاہے بیٹھ جائیں۔" اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا اور دوبارہ اپنی کتاب کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اتنے

انداز پر وہ تھوڑی سی خفیف ہوئی مگر پھر سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"کیا پڑھ رہے ہیں آپ؟" کافی دیر خاموش رہنا اس کی فطرت میں نہ تھا' اسی لیے بول پڑی۔

"دی ہابٹ۔" اس نے مختصراً کہا اور کتاب کا کور بادل نخواستہ اس کے آگے کر دیا۔

"یہ تو سمل کے پاس بھی ہے۔" وہ بے ساختہ کہہ اٹھی۔ (سمل جیسی فضول لڑکی تو ایک ہزار صفحوں والا اتنا ضخیم ناول پڑھ سکتی ہے' مگر اتنا ہینڈسم اور ڈیسنٹ آدمی .....)

"ایک منٹ میں آپ کی کتاب دیکھ لوں؟"

اس نے چپ چاپ کتاب اس کے ہاتھ میں پکڑا دی۔ وہ کچھ دیر تک تو صفحے الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی' مگر چونکہ کتابوں سے اس کو وحشت ہوتی تھی' اسی لیے جلد ہی لوٹا دی۔

"کیا کرتے ہیں آپ؟"

"رزلٹ کا انتظار کر رہا ہوں۔" وہ ناول پر سے نگاہیں ہٹائے بغیر بولا۔

"پھر؟"

"پھر کیا ظاہر ہے جاب کروں گا اگر مل گئی تو۔"

"کیا نام ہے آپ کا؟"

"کیوں؟" اس نے ترخ کر کہا تو وہ سٹپٹا کر رہ گئی۔

"کیوں کا کیا مطلب؟ آپ کا نام ہی پوچھا تھا۔ کیا نہیں پوچھ سکتی؟" وہ ایک ادا سے بولی۔

"ویل' نہیں۔" وہ اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"کیوں؟" ایک دم ہی وہ سلگ اٹھی۔

"میں اجنبیوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتا' وہ بھی آپ جیسی لڑکیوں سے۔"

"کیا مطلب' میری جیسی؟"

"میں نے کہا نا' میں اجنبیوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتا۔" اتنا کہہ کر وہ اٹھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہاں سے چل دیا۔

"ہونہہ۔" وہ بڑبڑائی غیر ترقی یافتہ ملک کے تنگ ذہن لوگ مگر ماہ نور جہانگیر یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اس شخص کی آنکھوں میں اس کے لیے اتنی نفرت کیوں تھی؟

☆ ☆ ☆

کیا تھا جو سینیٹر شیخ جہانگیر کے پاس نہ تھا۔

ہزاروں ایکڑ رقبے پر پھیلی جاگیر' کئی شاپنگ پلازے' کچھ ممالک میں پھیلی فائیو اور سکس اسٹار ہوٹلز کی چین' سینیٹرشپ اور ماہ نور جیسی خوب صورت بیٹی۔

سمل جیسی بیٹی بھی تھی۔ اور بہت فرق تھا سمل اور ماہ نور میں۔

ماہ نور جتنی خود غرض تھی' سمل اتنی ہی حساس تھی۔ ماہ نور جتنی آزاد خیال اور سوشل تھی' سمل اس سے کہیں زیادہ بیک ورڈ اور الگ تھلگ رہنے والی تھی' اور نور جتنی خوب صورت تھی' اس کی بڑی بہن اتنی ہی معمولی شکل و صورت کی تھی۔ جہاں نور مجسمۂ حسن تھی' وہاں سمل پیدائشی طور پر ایک ٹانگ سے مفلوج تھی۔

بچپن سے لے کر جوانی تک' ماہ نور کو ہمیشہ اہم ہونے کا احساس دلایا گیا تھا' وہ ہر محفل کی رونق ہوتی تھی گو کہ وہ سمل سے ایک سال چھوٹی تھی' مگر جب بھی جہانگیر باہر کہیں سے ان دونوں کے لیے گفٹس لاتے' سب سے پہلے ماہ نور اپنی پسند کے مطابق چیزیں اٹھا لیتی۔

جبکہ سمل جھجکتی ہی رہتی اور آدھی سے زیادہ چیزوں پر قبضہ ہو جاتا۔ رفتہ رفتہ سمل کو کپڑوں' جیولری اور اس طرح کی چیزوں سے نفرت ہو گئی۔ وہ آہستہ آہستہ اس دنیا کے باسیوں سے دور ہوتی گئی اس کی اپنی دنیا بن گئی تھی جہاں بس وہ ہوتی' یا اس کی کتابیں۔

جب سمل دو برس کی ہوئی تو اس کے والدین اس کی طرف سے مایوس ہو گئے تھے۔ جہانگیر نے ہر اچھے ڈاکٹر سے اس کا علاج کرانے کی کوشش کی مگر جس طرح بچپن کی عادتیں پوری زندگی جان نہیں چھوڑتیں' اس طرح یہ معذوری بھی اس کی زندگی کا حصہ بن گئی تھی۔

سمل' ماہ نور سے کافی زیادہ متاثر تھی۔ اس کے خیال میں ماہ نور جیسی بہن قسمت والوں کو ملتی ہے' جبکہ ماہ نور کے خیال میں اس کی بڑی بہن اس کے کسی گناہ کے عذاب کے طور پر اس کے سر پر مسلط کی گئی تھی' ورنہ کتنا ہی اچھا ہوتا اگر وہ سینیٹر جہانگیر کی اکلوتی بیٹی ہوتی' ان کی جائیداد کی تنہا وارث۔

سمل کو وہ شام نہیں بھولتی اس وقت وہ محض چھ برس کی تھی۔ اس کا کمرہ الگ تھا اور ماہ نور کا الگ۔

ماہ نور نے مما سے کہہ کر اپنے لیے اوپر والا روم سیٹ کروایا تھا' جب سمل نے بھی اوپر کسی کمرے میں رہنے کا کہا تو نور نے جھٹ سے کہا "لیکن تم تو لنگڑی ہو سیڑھیاں کیسے چڑھو گی؟"

سمل نے سر ہلا دیا اور نیچے والے کمرے میں ہی سونے لگی۔

اس رات بھی وہ سونے کے لیے لیٹی تھی' جب دروازہ کھول کر ماہ نور اندر داخل ہوئی۔

"کیا ہوا نور؟" وہ پریشانی سے بولی۔

نور نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اور دھیرے سے بولی۔ "آنکھیں بند کر لو۔" اس کے ہاتھ میں کچھ تھا جسے اندھیرے کے باعث وہ دیکھ نہ پائی تھی۔ ماہ نور کے حکم کی تعمیل میں سمل نے فوراً آنکھیں بند کر لیں کچھ دیر بعد اسے دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی تو اس نے جھٹ آنکھیں کھول دیں۔ ماہ نور اپنے پیچھے دروازہ بند کر کے جا چکی تھی۔

اس نے شانے اچکائے اور دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔

تھوڑی دیر بعد شدید احساس تپش کے باعث اس نے آنکھیں کھولی تھیں اور کمرے کا منظر دیکھ کر ایک لمحے کو تو وہ کانپ گئی تھی اور پھر زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ اس کے بستر کو آگ لگی ہوئی تھی ہر طرف شعلے اٹھ رہے تھے

......

یہ منظر یاد کر کے آج بھی اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے گو کہ اسے کوئی نقصان نہ پہنچا تھا اور ممی بروقت پہنچ گئی تھیں' لیکن وہ آج' چودہ برس بعد بھی اس واقعہ کے بارے میں سوچتی تھی کہ معلوم نہیں کیوں نور نے اس کے کمرے میں دانستہ طور پر آگ لگائی تھی؟

اسکول میں بھی اس کا کوئی دوست نہ تھا۔ وہ تنہائی پسند نہ تھی' مگر دوسرے بچوں کے رویے نے اس کو اپنے خول میں سمٹنے پر مجبور کر دیا تھا۔ گرچہ کلاس میں کوئی لڑکا یا لڑکی اس کا مذاق نہ اڑاتا تھا' نہ ہی کبھی کسی نے اس کی معذوری کی بابت کچھ کہا تھا۔ جس کی وجہ شاید اس کا بہترین لباس اور سب سے اچھی گاڑی میں اسکول آنا تھا یا پھر یہ کہ وہ اسکول اس کے ڈیڈ کے دوست کا تھا۔

جب اس نے گریڈ 8 کے ایگزامز دیے تھے' تب زندگی میں پہلی بار اس نے جہانگیر سے شکایت کی تھی۔

"ڈیڈ' جب سب بچے پیپر دے کر ہال سے باہر نکلتے ہیں تو ایک دوسرے سے بہت کچھ ڈسکس کرتے ہیں' مگر کوئی میرے ساتھ نہیں ہوتا کیوں؟" جہانگیر نے مسکرا کر اپنی بیٹی کی جانب دیکھا اور بولے "تو تم مجھ سے سب کچھ کہہ دو' میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

سمل مسکرا دی۔

اس رات جہانگیر صاحب نے اس سے بہت باتیں کیں۔ اتنا سمل کبھی پہلے نہیں بولی تھی جتنا ان دو تین گھنٹوں میں بولی' رات سونے سے پہلے وہ بہت مسرور تھی۔

"ڈیڈ میرے ہیں۔" وہ خوشی سے سوچنے لگی "اب مجھے کسی اور کی ضرورت نہیں ہے۔ اب میں ان کو اپنے ہر کام کے متعلق بتاؤں گی وہ شام کو روز مجھے فن لینڈ لے کر جایا کریں گے۔ پھر ہم لوگ آئس کریم کھائیں گے پھر واپس گھر آ کر میں ہوم ورک کروں گی' تب بھی ڈیڈ میرے ساتھ ہوں گے۔"

وہ مستقبل کے پلان بناتے بناتے سو گئی۔

صبح جب وہ سو کر اٹھی تو اس کا سامان پیک ہو چکا تھا۔ جہانگیر نے اسے بتایا کہ چونکہ وہ یہاں بہت اکیلی ہوتی ہے۔ اسی لیے وہ اس کو پڑھنے کے لیے انگلینڈ بھجوا رہے ہیں' جہاں وہ بورڈنگ ہاؤس میں رہے گی۔ وہاں اس کے ایج فیلوز اور بہت سے دوسرے بچے بھی ہوں گے' اور وہ بالکل بھی تنہائی محسوس نہیں کرے گی۔

وہ چپ چاپ سب کچھ دیکھتی رہی' ایک لفظ نہیں بولی۔ کہا وہاں جاتا ہے' جہاں کوئی سننے والا ہو۔

سو وہ بھی نہایت خاموشی سے برمنگھم آ گئی۔

☼ ☼ ☼

اسکول میں اس کے کلاس فیلوز نے اس کے متعلق ایک رائے قائم کر لی تھی کہ سمل جہانگیر لنگڑی ہونے کے ساتھ ساتھ گونگی بہری بھی ہے۔"

وہ زیادہ تر خاموش رہتی تھی' اگر بولتی تو محض ضرورت کے وقت۔

جب وہ Gcse کے لاسٹ ایئر میں تھی' ان دنوں اس کے ہاتھ لائبریری میں ایک ناول لگا۔ یہ پیری میسن سیریز کا ایک ناول تھا۔ پیری میسن سیریز کا سنسنی خیز کیس پڑھنے کے بعد اس نے پہلے تو اپنے آپ کو کوسا کہ اس سے پہلے اتنی اچھی کتاب کیوں نہ پڑھی' پھر اس نے لائبریری سے کئی کیسز نکال کر پڑھے۔

اس کے بعد سمل کو ایک بہانہ مل گیا تھا' حقیقت سے فرار ہونے کا' وہ دنیا سے چھپنے کے لیے کتابوں میں جا گھسی اب اس کو نہیں لگتا تھا کہ وہ پہلے کی طرح تنہا ہے۔

پھر ایک دفعہ اس نے خلیل جبران کا قول پڑھا "تنہائی کا شکوہ کبھی خدا سے نہ کرنا' کیونکہ وہ تو خود تنہا ہے۔"

یوں تو اس نے کبھی بھی خدا سے کوئی شکوہ نہ کیا تھا' مگر یہ پڑھنے کے بعد تو اس نے کبھی بھی اس کے حضور کوئی شکایت نہ پیش کی۔

وہ پاکستان اپنی اسٹڈی مکمل کر کے آئی تھی۔ جہانگیر صاحب چاہتے تھے کہ وہ مزید وہاں پڑھے۔ جب انہوں نے یہ بات اس سے کہی تو سمل نے محض اتنا کہا۔

"آپ کیوں نہیں چاہتے کہ میں پاکستان میں رہوں؟" اور فون بند کر دیا۔ جہانگیر صاحب تیسرے دن اس کے پاس تھے وہ اسے اپنے ساتھ واپس لے آئے۔

اس نے BBA آنرز میں ایڈمیشن لے لیا' مگر اس کا دل پڑھنے کو نہ چاہتا تھا' پھر پارٹ ون کے ایگزامز بھی نہیں دیے۔ پڑھائی سے اس کا دل اتنا اچاٹ ہو گیا تھا کہ اس نے پڑھائی ہی چھوڑ دی۔

اس کے والدین نے اسے اس فیصلے پر کچھ نہ کہا' کیونکہ وہ "اسپیشل چائلڈ" تھی وہ کچھ کہہ کر اسے ہرٹ نہیں کرنا چاہتے تھے۔

☼ ☼ ☼

ماما جب سے گھر آ کر وہ سیدھی سمل کے کمرے کی طرف گئی وہ اندر داخل ہونے ہی لگی تھی کہ ممی کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ وہ سمل سے کہہ رہی تھیں۔

"باہر نکلا کرو بیٹا! لوگوں میں گھومو پھرو' دوست بناؤ۔" ماہ نور ٹھٹک کر وہیں رک گئی۔ "کل کو تمہاری شادی ہو گی' اگر تم اسی طرح اپنے خول میں بند رہیں تو تمہارا ہسبینڈ کیا سوچے گا؟"

"ہونہہ' اس سے کون شادی کرے گا؟" ماہ نور نے حقارت سے سر جھٹکا۔

"مجھ سے کون شادی کرے گا' ممی؟" سمل نے سرد لہجے میں کہا۔

"کیوں؟ کیا کمی ہے تم میں؟" وہ ایک دم تڑپ اٹھیں "کیوں خود ترسی کا شکار ہو تم؟ بہت سی لڑکیوں سے بہتر ہو مہذب' سلیقہ مند' اعلا تعلیم یافتہ ہو' کیا کمی ہے تم میں؟"

"مما کی بات پر اس نے سر جھکا دیا۔ وہ اسے تسلیاں دے رہی تھیں' مگر کیا وہ نہیں سمجھتی تھی کہ وہ کتنی "قابل" ہے۔

کافی دیر بول کر جب وہ جانے کے لیے مڑیں تو ماہ نور کو
روازے پر کھڑا دیکھ کر چونک سی گئیں۔
"ارے ماہو' تم کب آئیں؟" انہوں نے پیار سے اس
کا گال چھوا۔ انہوں نے اس طرح کبھی سمل کا گال نہیں
چھوا تھا۔
"بالکل ابھی! سیدھی سمل سے ملنے چلی آئی" میں
اس کے لیے تحفے لائی ہوں' ماہ نور نے اپنے ہاتھ میں
پکڑے شاپرز کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
"ہاؤ آر یو' وہ خوش دلی سے اسے مخاطب کر کے پوچھنے
لگی۔
"ٹھیک ہوں۔" وہ ہمیشہ کی طرح مدھم لہجے میں بولی "تم
سناؤ ٹور کیسا رہا؟"
ماہ نور نے جواب دینے کے بجائے کندھے اچکا دیے۔
سمل چند ثانیے اس کا چہرہ تکتی رہی' مگر بولی کچھ نہیں۔
"اوہ! مجھے ایک کال کرنا تھی' تم یہ چیزیں دیکھو' میں چلتی
ہوں۔" وہ تیزی سے کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔
نجانے کیوں سمل کو لگا تھا جیسے وہ بہانہ کر کے کمرے
سے نکلی ہے۔
اس نے شاپرز اٹھائے اور اپنی گود میں رکھ دیے۔ یہ دو
شاپرز تھے۔ اس نے پہلا شاپر کھولا اندر ایک ڈبہ تھا۔ اس
کی وارڈ روب کے نیچے والے خانوں میں ایسے کئی ڈبے
پڑے تھے۔ یہ تمام ماہ نور ہی لائی تھی۔
سمل کو جوتوں سے نفرت تھی' اور نور ہر دفعہ اس کے
لیے کہیں نہ کہیں سے جوتے اٹھا لاتی تو اس نے تاسف
سے سر جھٹکا اور اپنی وہیل چیئر گھسیٹتے ہوئے اپنے کمرے
سے ملحقہ لائبریری کی جانب چلی گئی۔
وہ جب انگلینڈ گئی تھی تب بیساکھی استعمال کرتی تھی'
جب سے وہاں سے واپس آئی تھی' وہیل چیئر پر تھی اور
اب پہلے سے زیادہ معذور اور محتاج لگتی تھی۔
وہ وہیل چیئر گھسیٹتی ہوئی اپنی رائٹنگ ٹیبل کے
قریب پہنچ گئی۔ اس نے ڈیڈ سے صرف ایک خواہش کی
تھی۔
"مجھے ڈھیر ساری کتابیں لے دیں۔"
ڈیڈ نے اس کو ایک پوری لائبریری بنوادی تھی۔
وہ فریڈرک فورتھ کا ایک ناول نکال کر پڑھنے لگی' مگر
اس وقت اس کا جی کچھ بھی پڑھنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ سچ
مچ بہت ہرٹ ہوئی تھی۔

اس نے کتاب بند کر کے اس پر اپنا سر رکھ دیا۔
"میری زندگی میں کیا کبھی کوئی بہار آئے گی؟"

☼ ☼ ☼

"سمل! سمل!" مما اسے آوازیں دیتی ہوئی اس کی
اسٹڈی میں داخل ہوئیں تو اسے بانو قدسیہ کے "پروا" میں
گم پایا۔
"سمل!" وہ اس کے قریب آئیں اور اس کے کندھے
پر ہاتھ رکھا تو وہ ایک دم چونک پڑی۔
"پلیز بیٹا! ان کتابوں کا پیچھا چھوڑ دو پلیز!" وہ مصنوعی
خفگی سے بولیں تو سمل بے اختیار ہنس دی۔
"چلو' باہر چلتے ہیں ٹھیک؟"
"کدھر' مما؟"
"باہر' ریس کورس پارک میں' یہاں سے قریب پڑتا ہے
نا؟"
"میں وہاں جا کر کیا کروں گی؟" وہ دھیرے سے بولی۔
"سمل' کتنا عرصہ ہو گیا ہے تم گھر سے باہر نہیں نکلیں
تمہیں چینج چاہیے۔" وہ سمجھانے لگیں۔
"گھڑی بھر کو باہر نکلنے سے میری زندگی میں کیا چینج
آجائے گا؟" سمل نے سر جھکا کر زیر لب کہا۔
"سمل! تم اتنی مایوس کیوں ہوتی ہو۔" وہ اس کی وہیل
چیئر گھسیٹتے ہوئے باہر لے آئیں۔
اس نے ارد گرد دیکھا موسم بھی بہت پُر لطف اور سہانا
سہانا سا تھا' اور ہریالی بھی بہت تھی جلد ہی وہ پارک پہنچ
گئیں۔
مما نہ جانے کون سے قصے کہانیاں سنا رہی تھیں' سمل
نے گود میں رکھی کتاب کھول لی۔
"سمل! وہ مجھے سامنے مسز نصیر نظر آرہی ہیں۔ حیرت
ہے' آج ان کی بہو بھی ان کے ساتھ ہے۔ پہلے تو دونوں
میں خاصی ان بن تھی' تم یہیں ٹھہرو' میں ابھی آئی۔"
مما نے کہا تو اس نے سر ہلا دیا اور ساری حسیات کو اپنی
کتاب پر مرکوز کر دیا۔
بمشکل پانچ منٹ ہی گزرے تھے کہ اس کی وہیل چیئر
دوبارہ چل پڑی۔ وہ کتاب میں اتنی گم تھی' اسے خیال ہی
آیا کہ مما اتنی جلدی کیسے واپس آگئیں' نہ ہی اس نے
سوچا کہ مما خاموش کیسے ہیں۔ وہ تو بس ان لفظوں میں گم
رہی تھی جو ان صفحات پر لکھے تھے۔

اس نے سر تب اٹھایا جب لگا کہ اس کی وہیل چیئر رک
گئی ہے۔ سمل نے گردن موڑ کر اپنے پیچھے اور اطراف
میں دیکھا۔ وہ جس سڑک پر موجود تھی اس کے بالکل
سامنے "جہانگیر پیلس" تھا' لیکن مما وہاں نہیں تھیں۔
آخر وہ کہاں چلی گئیں؟
اس نے کتاب گود میں رکھی اور اپنی وہیل چیئر کو کھینچتے
ہوئے گھر کی طرف لے گئی۔
رات کو مما اس کے کمرے میں آئیں۔
"سوری بیٹا! میں مسز نصیر سے باتوں میں لگ گئی۔
دراصل ان کے ڈیزائنر کے پاس کچھ نئے آوٹ فٹس
آئے ہوئے تھے' وہ مجھے وہیں اس کے آوٹ لٹ پر لے
گئیں۔ مجھے تو بالکل بھول ہی گیا کہ میں نے تمہیں وہیں
پارک میں چھوڑ دیا تھا۔ میں نے گھر فون کیا تو نجمہ نے بتایا
کہ تم گھر پہنچ چکی ہو اسی لیے میں....."
وہ اپنی مصروفیات یا "بہانے" گنوا رہی تھیں' مگر سمل
خاموش بیٹھی اپنی ہی سوچوں میں گم تھی۔
اگر مما واپس نہیں آئی تھیں تو کافی دیر تک میری وہیل
چیئر کس نے چلائی تھی؟ مجھے گھر کے پاس کس نے چھوڑا
تھا؟ سمل کے پاس ان سوالوں کا جواب نہیں تھا۔ وہ عجیب
مخمصے میں پھنس کر رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"نجمہ...... نجمہ۔" اگلی شام وہ گود میں ہمیشہ کی طرح ناول
رکھے' وہیل چیئر کو پہیوں سے گھسیٹتی کچن کی طرف آئی۔
"جی بی بی!" نجمہ اس کی پکار کے جواب میں بوتل کے
جن کی طرح "فوراً" کچن سے نکل کر آئی۔
"سنو نجمہ! تم میرے ساتھ باہر ریس کورس پارک میں
چلتی ہو؟"
نجمہ نے بغور اپنی مالکن کا چہرہ دیکھا۔ ایک بڑی بیگم
صاحبہ اور ماہ نور بی بی تھیں کہ ہر وقت ناک پر غصہ دھرا رہتا
خوامخواہ چیختی چنگھاڑتیں اور ایک سمل بی بی تھیں۔ ایک
چھوٹا سا کام بھی یوں کہتیں' جیسے درخواست کر رہی ہوں۔
وہ سمل کو لے کر پارک میں آگئی۔
وہ کچھ دیر ایک درخت کے پاس بیٹھی ادھر ادھر دیکھتی
رہی۔ پھر اس نے گود میں رکھا ناول کھول لیا۔
چند ساعتیں ہی گزری تھیں کہ کسی نے اس کا ہاتھ
دھیرے سے ہلایا۔ سمل نے سر اٹھا کر اپنے سامنے کھڑے

سات آٹھ سالہ بچے کو دیکھا' جس کے ہاتھ میں ایک ادھ
کھلا خوب صورت سا گلاب کا پھول تھا۔ اس نے وہ پھول
اس کی جانب بڑھا دیا۔
"یہ آپ کے لیے ہے۔" وہ معصوم سے لہجے میں بولا۔
"کس نے دیا ہے؟" وہ دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھنے
لگی۔
"انہوں نے بتانے سے منع کیا ہے" اتنا کہہ کر وہ وہاں
سے بھاگ گیا۔
اس نے ہاتھ میں پکڑے سفید گلاب کو دیکھا۔ سفید
گلاب بچپن سے اس کی کمزوری تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ ساری رات سو نہیں سکی تھی۔ یونہی بستر پر لیٹی
چھت کو گھورتی رہی۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور
تھی۔ اس کے تکیے کے پاس وہی ادھ کھلا گلاب پڑا تھا۔
پتیوں کے کنارے مرجھا کر ہلکے سے زردی مائل ہو گئے
تھے' مگر خوشبو ویسی ہی تھی۔
اذانوں کی آواز آئی تو اسے کچھ ہوش آیا۔ وہ اٹھی اور
باتھ روم کی طرف چل دی۔ اس وقت اس کے دائیں بازو
کے ساتھ بیساکھی لگی تھی۔ وہ جب بھی بیساکھی استعمال
کرتی تو اس کا وجود قدرے مکمل لگتا تھا۔
نماز ادا کرنے کے بعد وہ حسب معمول اپنی اسٹڈی کی
جانب چلی گئی۔
لیکن آج اس کا جی کچھ پڑھنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ
یونہی بیٹھی کتابوں سے بھرے ریکس کو دیکھتی رہی۔ سمل
نے دنیا کو کتابوں سے جانا تھا۔ اس نے کائنات کو پڑھ کر
دیکھا تھا اور دیکھنے والوں سے زیادہ دیکھا تھا۔
سمل نے وہ سفید گلاب "الکھ نگری" کے ایک صفحے پر
رکھ کر اسے بند کر دیا۔ یہ پھول اس کے لیے بہت خاص
تھا۔
جب بھی کبھی کسی نے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا
(گو کہ ایسے لوگ گنے چنے تھے) وہ ہمیشہ افسردہ ہوئی۔ اسے
لگتا کہ وہ اس پر ترس کھا رہے ہیں' لیکن زندگی میں پہلی بار
اس کا دل چاہا تھا کسی سے دوستی کرنے کا' کسی نے اس کو
سفید گلاب دیا تھا جو دوستی کی نشانی ہوتا ہے۔
"نجمہ! میرا یہ والا سوٹ تو پریس کر دو۔" اس نے مسٹرڈ
اور چاکلیٹ امتزاج کا ایک نہایت خوب صورت سوٹ

نکال کر نجمہ کے حوالے کیا۔ نجمہ کچھ حیران سی ہو کر اپنی سادہ اور کم گو مالکن کی جانب دیکھنے لگی۔ کل سے اسے سمل کا رویہ بہت مختلف سا لگ رہا تھا۔

کپڑے زیب تن کرنے کے بعد اس نے بالوں کو ادھ کھلے جوڑے کی شکل میں باندھنا چاہا، مگر نجمہ نے روک دیا۔

"نہ بی بی! بال کھلے چھوڑ دو، اتنے سوہنے بال ہیں تمہارے، بندھے ہوئے ہوں تو سارا حسن ماند پڑ جاتا ہے۔"

اس کے بال واقعی خوب صورت تھے کمر تک گھنے سیاہ بال! شاید اس کے ظاہر میں ایک یہی حسین چیز تھی۔ اس نے بال کھلے چھوڑ دیے۔

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی ساڑھے چار ہو رہے تھے۔ سردیوں کی شامیں بہت جلدی ڈھلنے لگتی تھیں۔

"اب مجھے پارک میں چھوڑ آؤ تم پھر بے شک واپس آجانا۔"

"جیسے تہاڈا حکم" کی عملی تفسیر بنی نجمہ اس کو پارک میں چھوڑ کر خود لوٹ آئی۔

وہ وہیں درخت کے تنے کے قریب انتظار کرنے لگی۔ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ کس کا انتظار کر رہی ہے۔

کچھ دیر بعد اس نے ایک بچے کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں سفید گلابوں کا گلدستہ تھا، جسے اس نے سمل کو تھما دیا۔

"اٹس فار یو۔"

"بیٹا! یہ کس نے دیا ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "انہوں نے بتانے سے منع کیا ہے۔" وہ کہہ کر جانے لگا۔

سمل نے سر کے اشارے سے اس کو روکا اور اپنے پرس کی زپ کھولی۔ وہ گھر سے انتظام کر کے آئی تھی پرس سے ایک کیڈبری کرلی ورلی کا بار نکال کر اس کے سامنے لہرایا "اب؟" وہ آنکھوں میں امید کے دیے روشن کیے بولی۔

"سوری۔" بچے نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا اور پاکٹ سے کٹ کیٹ کے دو بار نکال کر اس کو دکھائے۔ "مجھے کیڈبری نہیں کٹ کیٹ پسند ہے ان کا ٹیسٹ آپ سے زیادہ اچھا ہے۔" اتنا کہہ کر وہ وہاں سے بھاگ گیا۔

سمل بے اختیار ہنس دی۔

اس نے اپنی نگاہیں پھولوں پر مرکوز کر دیں اس کی ٹہنی سے ایک باریک کاغذ لپٹا تھا۔ اس نے کاغذ نکال کر اس پر لکھی گئی تحریر پڑھی۔

وہ اتنی خوب صورت تو نہ تھی، مگر اسے اچھا لگا تھا کہ کسی کا اس کو سراہنا، یوں اس کی تعریف کرنا۔

اس دن کے بعد وہ روز پارک آتی، روز ہی کوئی بچہ اس کو پھول پکڑا دیتا۔ ان کے ساتھ مختلف نوٹ ہوتے، جنہیں سمل نے اپنی الماری کے لاکر میں سنبھال کر رکھ دیا تھا۔ ہر دفعہ انگریزی میں ایک دلکش بات لکھی ہوتی۔ اس کے نیچے ہمیشہ K.Z لکھا ہوتا۔

اس کو اس کی لکھائی بہت پسند تھی۔ ہر نوٹ پر اس خوب صورت لکھائی میں کچھ نہ کچھ نہایت خوب صورت لکھا ہوتا تھا۔

"آپ پر نیلا کلر بہت سوٹ کرتا ہے پلیز پہنا کریں۔"

"آپ کی آنکھیں بہت خوب صورت ہیں۔"

"آپ کے بال بہت حسین ہیں پلیز کھولا کریں۔"

"آپ کے ہاتھ میں پکڑی کتاب آپ کے ذوق کی عکاس ہے۔ آئی رئیلی لائیک اٹ۔"

"آپ پلیز بچوں کو رشوت مت دیا کریں۔ سارے بچے میرے وفادار ہیں۔"

ایسے کئی نوٹ اس کے پاس محفوظ تھے۔

اس کا فیورٹ کلر بلیو تھا اسی لیے اس نے آج شام نیوی بلیو ڈریس زیب تن کیا تھا۔ ماہ نور فرانس سے جو نازک سے جوتے لائی تھی، اس نے وہ پہنے اور شال اوڑھنے کے بجائے شانوں پر میچنگ دوپٹہ لے لیا۔ نجانے کتنے برس بعد وہ اپنے کمرے سے باہر بیساکھی کے سہارے چلتی ہوئی جا رہی تھی۔ وہ پارک اپنے ساتھ کوئی نہ کوئی کتاب ضرور لے کر جاتی تھی، مگر آج اس نے جان بوجھ کر کتاب نہ اٹھائی تھی۔

آج وہ کافی کچھ پلان کر کے آئی تھی۔ آج جب وہ بچہ پھول لے کر آئے گا تو میں یہ کہہ کر نہیں لوں گی کہ جس نے بھیجے ہیں، اس سے کہو خود آ کر دیں۔

اپنی مخصوص جگہ کے ساتھ پڑے سنگی بینچ پر سمل بیٹھ گئی۔ اس کو بیٹھے تقریباً آدھا گھنٹہ بیت گیا مگر کوئی پھول نہ لایا تو وہ پریشان سی ہو گئی۔ دفعتاً اس کی نگاہ کچھ ہی فاصلے پر کھیلتے بچوں پر پڑی، جو بچے روز اس کے لیے پھول لاتے تھے، ان میں سے ایک وہاں موجود تھا سمل نے اشارے

FEEN
ID
Preparation
fication

ے اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ فٹ بال ہاتھ میں پکڑے ذب سا ہو کر اس کے قریب چلا آیا۔

"جی؟"

"بیٹا! آج آپ میرے لیے پھول نہیں لائے؟"

"وہ میں تھوڑی لاتا تھا۔ وہ تو سر لاتے تھے۔" "آج غالباً" ں کو چاکلیٹ نہیں ملی تھی۔

"کون سے سر؟" وہ محتاط لہجے میں پوچھنے لگی۔

"ہمارے اسپورٹس ٹیچر ہیں۔" وہ شانِ بے نیازی سے لا۔

"نام کیا ہے آپ کے سر کا؟"

"سر زید۔"

"پورا نام کیا ہے؟"

"پتا نہیں۔" اس نے شانے اچکائے۔

"وہ آج پھول نہیں لائے؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟" وہ مایوسی سے پوچھنے لگی۔

"پتا نہیں۔" اتنا کہہ کر وہ وہاں سے چلا گیا۔

"وہ کیوں نہیں آیا آج؟ مسلسل بائیس دنوں سے وہ مجھے پھول بھجواتا رہا ہے۔ آج کیوں نہیں آیا؟"

وہ کافی دیر وہیں بیٹھی اس گم نام شخص کے بھجوائے گئے پھولوں کا انتظار کرتی رہی مگر کوئی نہ آیا۔

اندھیرا پھیل چکا تھا جب وہ گھر لوٹی تو جہانگیر اور سلمیٰ کو لان چیئرز پر بیٹھے باتیں کرتے دیکھا۔

سمل کو دیکھ کر وہ دونوں کچھ ٹھٹھک کر خاموش ہو گئے۔

آج جب وہ اپنے عمدہ لباس کے ساتھ کانوں میں ننھے سے آویزے پہنے بغیر وہیل چیئر یا کتاب کے کہیں باہر سے گھر کے اندر داخل ہو رہی تھی تو ان دونوں کا چونکنا فطری امر تھا۔

"سمل بیٹا! ادھر آؤ یہاں بیٹھو۔" جہانگیر صاحب نے کہا تو وہ دھیرے دھیرے چلتی ان کے برابر والی کرسی پر آ کر بیٹھ گئی۔

"کہاں تھیں؟" ممی ہشاش بشاش لہجے میں پوچھنے لگیں۔

"ایسے ہی پارک میں سیر کرنے گئی تھی۔" اس کا انداز بہت عام سا تھا۔

ایک دم اسے ایک خیال آیا۔

"ڈیڈا!" اس نے دھیرے سے ان کو مخاطب کیا۔ "آپ کی گاڑی اور ڈرائیور ہو گا؟ مجھے واپس پارک جانا ہے۔ میں وہاں کچھ بھول آئی ہوں۔"

"چلو تمہیں لے چلتا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

پارک پہنچ کر وہ جلدی سے گاڑی سے نکلی اس کی نگاہیں کسی کو کھوج رہی تھیں۔ جلد ہی اس کو اس کا مطلوبہ چہرہ نظر آ گیا۔ یہ وہ بچہ تھا جو پہلے دن اس کے لیے سفید پھول لایا تھا۔ وہ اس کے قریب گئی۔

"بیٹا! آپ کو یاد ہے آپ میرے لیے پھول لائے تھے؟"

"وہ سر زید نے دیے تھے۔"

"آپ کے اسکول کا نام کیا ہے؟"

بچے نے بتا دیا تو وہ فوراً مڑی اور واپس جا کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ "کیوں؟ مل گئی تمہاری چیز؟" ڈیڈ نے اس کی فوراً واپسی اور خالی ہاتھوں کے پیش نظر کہا۔

"جی!" انہوں نے گاڑی چلا دی۔ وہ خاموش بیٹھی کچھ سوچتی رہی۔

"ڈیڈ آپ اس اسکول میں کسی کو جانتے ہیں؟" اس نے سر زید کے اسکول کا نام لیا۔

"نہیں، کیوں؟"

"آپ اسکول کے پرنسپل سے میری اپائنٹمنٹ لے سکتے ہیں؟"

"اپائنٹمنٹ کی کیا ضرورت ہے، بس تم کام بتاؤ؟"

"وہ ڈیڈ دراصل ان کے اسکول میں ایک اسپورٹس ٹیچر ہیں، مسٹر زید میں یہ کنفرم کرنا چاہتی ہوں کہ کہیں یہ میرے ایک پرانے فرینڈ تو نہیں، اگر آپ مجھے ان کا فون نمبر یا ایڈریس دے دیں تو؟" اس نے ہچکچاتے ہوئے جھوٹ کی آمیزش کے ساتھ سچ بولا۔

"نو پرابلم میں جلد ہی تمہیں بتا دوں گا۔" جہانگیر صاحب نے گاڑی پارک کرتے ہوئے کہا۔



"سمل! یہ ایک پیپر تمہارے ڈیڈ نے تمہارے نام فیکس کیا ہے۔ تم دیکھ لو۔" اگلی صبح ممی اس کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھما کر چلی گئیں۔

اس نے پڑھا۔

"سمل! سینیٹ کے اجلاس میں فوری جانا ہے۔ تم سو رہی تھیں، اس لیے تمہارے فرینڈ کا فون نمبر لکھ کر جا رہا ہوں۔"

نیچے ڈیڈ کی خوب صورت لکھائی میں "خرم زید" کا فون نمبر لکھا تھا۔ سمل نے وہ نمبر نوٹ کر لیا۔

"شاید اس کی ضرورت ہی نہ پڑے، وہ آج شام آ جائے۔" اس نے سوچا۔

لیکن جب وہ پانچ روز تک نہ آیا تو اس نے خرم کے ایک شاگرد سے اس کے متعلق پوچھا۔

"وہ تو اسکول چھوڑ کر چلے گئے ہیں، اب ہمارے نئے سر آ گئے ہیں۔"

وہ مایوس ہو کر خاموش ہو گئی۔

پھر کتنے ڈھیر سارے دن یونہی گزر گئے۔ وہ روز پارک جاتی، وہ اس سے ملنا چاہتی تھی، ایک بار بس ایک بار وہ خرم سے وہ سوال پوچھنا چاہتی تھی جو پہلے دن سے ہی اس کے دماغ میں گھوم رہا تھا۔

اس کے خیالات میں مخل ہونے والی ماہ نور تھی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں زور سے دروازہ کھول کر آئی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں دو ہینگر پکڑ رکھے تھے جن پر دو ڈریسز لٹک رہے تھے۔

"سنو سمل! میں ان میں سے کون سا پہنوں؟ یلو والا یا ریڈ والا؟"

یہ ماہ نور کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ وہ نت نئے ڈریسز، جیولری اور جوتے لا کر نہایت معصومیت سے سمل سے پوچھتی کہ ان میں سے کون سا اچھا ہے۔ مقصد محض سمل کو اس کی محرومی کا احساس دلانا تھا اور وہ ہمیشہ اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتی۔ اسی وجہ سے سمل کو ان چیزوں سے نفرت ہو گئی تھی۔

"بتاؤ کون سا اچھا ہے؟" اس سوال پر سمل کا موڈ مزید خراب ہو گیا۔

"سچ بتاؤں؟" وہ روکھے لہجے میں بولی۔

"آف کورس۔"

"دونوں انتہائی بے ہودہ ہیں۔" زندگی میں پہلی بار اس نے ماہ نور سے اس طرح بات کی تھی۔

ماہ نور نے حیرت سے اپنی بڑی بہن کو دیکھا۔ وہ بیڈ پر بیٹھی تھی جس کی پا ئلتی کے ساتھ اس کی بیساکھی پڑی تھی۔ اس میں وہ تبدیلی آ گئی تھی، جس سے ماہ نور پچھلے کئی برس سے ڈرتی تھی۔ اگر سمل بدل گئی تو وہ اس پر سبقت لے جائے گی اور ماہ نور کہیں بیک گراؤنڈ میں غائب ہو کر رہ جائے گی۔

"کیوں؟ کیا خرابی ہے ان میں؟" ماہ نور اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

"خرابی تمہاری چوائس میں ہے۔ یہ ریڈ کلر اتنا برائٹ ہے کہ تمہیں سوٹ نہیں کرے گا، اور یلو، وہ تو بہت ہی چیپ لگے گا۔" اس نے انتہائی صاف گوئی سے کہا۔

"سمل! تمہارے جوتے تھوڑے چیپ ہیں، بالکل آؤٹ آف فیشن تمہارے کمپلیکشن پر یہ کلر سوٹ نہیں کرتا۔" ماہ نور اسی کے الفاظ واپس لوٹا رہی تھی۔

"ہاں میں نے کہا نا تمہاری چوائس چیپ ہے، یہ تم ہی لائی تھیں کراچی سے میرے لیے۔" سمل نے اطمینان سے کہا تو ماہ نور سٹپٹا کر رہ گئی۔

"نورا پلیز اگر کوئی اور بات نہ ہو تو کچھ دیر کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" ماہ نور تیزی سے مڑی اور زور سے دروازہ بند کر کے چلی گئی۔

کچھ سوچ کر سمل نے بیڈ سائیڈ ٹیبل سے اپنی ڈائری نکالی جہاں خرم کا نمبر لکھ رکھا تھا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے نمبر ملایا تیسری گھنٹی پر فون اٹھا لیا گیا تھا۔

"ہیلو؟" کسی لڑکی کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

وہ خاموش رہی۔

"ہیلو؟" لڑکی نے اب کی بار قدرے زور سے کہا۔

اسے بیک گراؤنڈ میں ایک مردانہ آواز سنائی دی۔

"تجل! کس کا فون ہے؟"

"پتہ نہیں بھائی! کوئی بول ہی نہیں رہا۔" لڑکی نے پیچھے جواب دیا۔

"تو پھر بند کر دو نا۔" اتنا ترخ کر کہا گیا تھا کہ سمل سٹپٹا کر رہ گئی۔ فون کھٹاک سے بند ہو گیا۔ شاید اس نے غلط نمبر ملا دیا تھا۔ ٹون دوبارہ آنے پر اس نے پھر وہ نمبر ڈائل کیا جو ڈائری پر لکھ کر رکھا تھا۔

دوسری طرف مسلسل گھنٹی جا رہی تھی۔ کوئی نویں گھنٹی پر فون اٹھا لیا گیا۔

"ہیلو!" ایک گمبھیر آواز اس کے کانوں میں گونجی وہ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں جان گئی کہ یہ وہی ہے جو ابھی تجل نامی لڑکی کو فون بند کرنے کا کہہ رہا تھا۔

"ہیلو۔" وہ اپنے مخصوص مدھم لہجے میں بولی۔

"جی فرمائیے۔" نہایت مصروف لہجے میں کہا گیا۔

"م، مجھے خرم زید سے بات کرنی ہے۔"

"بول رہا ہوں آپ کون؟"

وہ جسے آپ روز پھول بھجواتے تھے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔

"ہیلو؟" وہ سمجھا لائن منقطع ہو گئی ہے۔

"جی؟" وہ جلدی سے سنبھل کر بولی۔

"آپ کون بات کر رہی ہیں؟" خرم نے دوبارہ استفسار کیا۔

"م میں سمل ہوں سمل جہانگیر۔" اس نے ڈرتے ڈرتے بتایا۔ پتہ نہیں اس کا کیا ردِ عمل ہو گا؟ وہ خوش ہو گا یا پھر غصہ کرے گا؟

چند ساعتیں خاموش رہنے کے بعد وہ بولا "تو آپ سمل جہانگیر ہیں۔"

"جی آپ نے مجھے پہچان لیا؟" وہ اپنے لہجے کی مسرت چھپاتے ہوئے بولی۔

"پہچانا کیسے نہیں؟ آپ تو غالباً "کوئین آف جارڈن" ہیں یا "پرنس آف ویلز" جو میں نام سنتے ہی پہچان جاؤں گا۔" اتنے قطعی انداز پر وہ خفیف سی ہو گئی "سوری رانگ نمبر۔"

"رانگ نمبر کیسے؟ خرم زید میرا ہی نام ہے مگر آپ کون ہیں؟" اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔

"میں وہ لنگڑی اور بد صورت لڑکی ہوں، جس پر ترس کھا کر آپ اسے پھول بھجواتے تھے۔" وہ رُندھے ہوئے لہجے میں بولی۔

چند ثانیے دوسری طرف خاموشی چھائی رہی۔ بالآخر وہ بولا "مگر پارک میں میں نے جس لڑکی کو دیکھا تھا وہ معذور ضرور تھی مگر تھی بہت خوب صورت۔" اس کا لہجہ اب کی بار بہت نرم تھا۔

ایک انجانی خوشی نے سمل کا احاطہ کر لیا۔ "آپ شام کو پارک میں آئیں گی؟" وہ بولا۔

"میں تو روز ہی آتی ہوں۔"

"میں آپ سے ملتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ شاید میں آپ کو پسند نہ آؤں۔"

"آپ آئیں گے نا؟" وہ بچوں کی طرح اصرار کرنے لگی۔

"اگر آپ بال کھول کر، نیلا ڈریس پہن کر آئیں گی تو میں ضرور آؤں گا!" سمل کے چہرے پر مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے الوداعی کلمات کہہ کر فون رکھ دیا اور شام ہونے کا انتظار کرنے لگی۔



اس نے کوئی خاص اہتمام نہیں کیا تھا۔ بس نیلے کپڑے پہنے اور بال کھولے تھے۔ اپنے آپ کو آئینے میں دیکھنے کا تکلف کیے بغیر ہی وہ کمرے سے نکلی اور لاؤنج سے ہوتی ہوئی صدر دروازے کی طرف بڑھی۔ لاؤنج میں ماہ نور بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اس کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنا ہی چاہتی تھی کہ اس کی آواز سمل کے کانوں سے ٹکرائی۔

"سمل! تم آج کل کچھ زیادہ ہی آوارہ گرد نہیں ہوتی جا رہی۔ روز شام کو کہاں نکل جاتی ہو؟" رات کو دو بجے گھر لوٹنے والی ماہ نور کڑے تیوروں سے پوچھنے لگی۔

"میں تو پارک جا رہی ہوں۔" سمل نے دھیرے سے جواب دیا۔

"واک کرنے؟" ماہ نور نے استہزائیہ مسکراہٹ اس کے جانب اچھالی۔

وہ سر جھٹک کر آگے بڑھی۔ عقب میں اسے انی بہن کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ "نجمہ! پھپھو کو ساتھ لیتی جاؤ کہیں گر گئیں تو پھر اٹھانے کون آئے گا؟"

سمل کی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ وہ تیزی سے دروازہ کھولتے ہوئے باہر نکل گئی۔ پارک پہنچنے تک اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا تھا۔ وہ سنگی بنچ پر بیٹھ گئی۔

"وہ کیسا ہو گا؟ اس نے کہا تھا کہ وہ اس سے ملنے سے ڈرتا ہے کہ شاید اس کو وہ پسند نہ آئے کیوں؟ کیا وہ بہت عام شکل کا ہو گا؟ مجھ سے بھی زیادہ؟" اس نے سوچا۔

"ہیلو!" ایک نرم گرم سی آواز اسے اپنے عقب میں سنائی دی۔ اس نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ جو پہلا نام سمل کے ذہن میں آیا وہ ڈارسی تھا جین آسٹن کا ڈارسی، الزبتھ کا ہیرو۔

وہ ہینڈسم تھا، بلکہ بہت زیادہ ہینڈسم۔ اس کی آنکھوں پر کسی مغلئی شہزادے ـــــ کا گمان ہوتا تھا۔ اس کی اٹھی ہوئی یونانی ناک چہرے کے پرکشش نقوش کو بہت مغرور سا تاثر دے رہی تھی۔

خرم نے ہاتھ میں پکڑا لمبی ٹہنی والا سرخ گلاب سمل کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ تمہارے لیے ہے۔"

"کیا سوچ رہی ہو؟" وہ دلچسپی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ڈارسی۔" وہ بڑبڑائی۔

"کیا؟" وہ سن نہیں پایا تھا۔

"کچھ نہیں۔" اس نے نگاہیں گلاب پر مرکوز کر دیں۔ خرم نے اس سے پہلے اس کو سرخ گلاب نہیں بھجوایا تھا۔

"میں تمہاری توقعات پر پورا نہیں اترا؟" خرم کے لہجے میں اداسی تھی۔ "یہی بات ہے نا؟"

"ہاں۔" وہ مدھم لہجے میں بولی۔

"تم نے میرے بارے میں کیا سوچا تھا؟"

"آپ کو میں نے جیسے سوچا تھا، آپ اس سے زیادہ ہینڈسم ہیں۔"

"پھر؟" اس کے آرام سے کہنے پر سمل نے نا سمجھی کے عالم میں اس کی جانب دیکھا۔

"اگر میری شکل اچھی بھی ہے تو اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔ یہ تو اوپر والے نے بنائی ہے۔ انسان کا کمال تو وہ ہوتا ہے جو وہ خود کرے یا اپنی محنت سے حاصل کرے۔ جو چیز دسترس سے ہی باہر ہو، اس پر غرور کرنا یا شرمندہ ہونا غلط ہے۔"

"بات میرے سر پر سے گزر گئی۔" وہ سمجھنے کے باوجود بولی۔

"نہیں، تم سمجھنا ہی نہیں چاہتیں مجھے ذرا یہ کتاب دکھاؤ۔" اس نے اس کے ہاتھ سے باربرا کارٹ لینڈ کا ناول لیتے ہوئے کہا۔

"تم کس کس کو پڑھتی ہو؟" یہ وہ سوال تھا جو سمل سے پہلے کبھی کسی نے نہیں کیا تھا۔ وہ زیادہ نہیں بولتی تھی مگر اس کے جواب میں وہ تقریباً "آدھا گھنٹہ" بولتی رہی۔

سمل نے اپنی تمام کتابوں، ان کے لکھاریوں کے نام، اپنے پسندیدہ اور ناپسندیدہ کردار گنوا دیے۔ یہ سمل کی دنیا تھی۔ لفظوں کی، قلم اور کاغذ کی دنیا کرداروں کی ایک کہکشاں تھی۔

ایک دم وہ خاموش ہو گئی۔ اسے احساس ہوا کہ کافی دیر سے وہی مسلسل بول رہی ہے جبکہ خرم ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے اس کو خاموشی سے تک رہا تھا۔

"خاموش کیوں ہو گئی ہو؟" وہ استفسار کرنے لگا۔ "آپ کیوں خاموش ہیں؟" وہ بولی۔

"میں تو تمہیں سن رہا ہوں۔ تمہاری نالج بہت اچھی ہے، اچھا اور بتاؤ۔"

"مجھے اور کچھ نہیں پتہ۔" وہ مزید کچھ نہیں بولنا چاہتی تھی۔

"تم بولتے ہوئے بہت اچھی لگتی ہو۔ میں تمہیں سننا چاہتا ہوں۔" اس کی بات پر وہ حیران سی ہو کر اسے تکنے لگی۔

"اتنی حیرت زدہ کیوں ہو رہی ہو؟ میرے سر پر سینگ اُگ آئے ہیں کیا؟"

وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"لڑکی ہو تو تمہارے جیسی نا کہ ....." وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

"نہ کہ کس جیسی؟" وہ معصومیت سے پوچھنے لگی۔

"کچھ نہیں ذہن میں کسی ناپسندیدہ شخص کا خیال آ گیا تھا۔" خرم نے سر جھٹکا۔ "تم بتاؤ تم پڑھنے کے علاوہ اور کیا کرتی ہو؟ اور ہاں، میرا نمبر تمہیں کہاں سے ملا؟"

ایک خفیف سا تبسم سمل کے لبوں کو چھو گیا۔ اس نے سر جھکا دیا اور دھیرے دھیرے ساری بات اس کے گوش گزار کر دی۔

"اوہ! یہ ضرور دانیال کا بچہ ہو گا! ورنہ میرے اسٹوڈنٹس مجھ سے غداری نہیں کرتے۔" وہ مصنوعی تاسف سے بولا۔

"تم کیا کرتے ہو؟" وہ تکلف کی دیواریں گرا کر بولی "اسکول میں اسپورٹس ٹیچر ہو؟"

"دراصل اسکول کے پرنسپل میرے ابا کے دوست تھے۔ انہوں نے مجھے فٹ بال کھیلتے دیکھ کر جھٹ آفر کر ڈالی تو میں نے بھی فی سبیل اللہ جاب شروع کر دی۔"

"پھر چھوڑ کیوں دی؟"

"مجھے کوئی باقاعدہ جاب شروع کرنا ہے۔ میرا رزلٹ آنے میں ابھی دیر ہے۔ تب تک کوئی چھوٹا موٹا کام ڈھونڈ رہا ہوں۔"

"کیوں؟" وہ معصومیت سے پوچھنے لگی۔

"کیونکہ میں بھوکا نہیں مرنا چاہتا سمل بی بی! مجھے گھر کا خرچہ پانی بھی چلانا ہے۔"

"اوہ!" اس کے منہ سے نکلا۔

"تم روز مجھے پھول بھجواتے تھے پھر پچھلے کافی دن تک تم نظر ہی نہیں آئے۔ کہاں تھے؟" وہ دانستہ موضوع بدل گئی۔

"بس کچھ مسائل تھے۔"

"اس دن تم نے میری وہیل چیئر کافی دیر تک چلائی تھی نا؟" وہ ہنس پڑا۔
"تمہیں میرے گھر کا کیسے پتہ چلا؟"
اس سوال پر خرم نے قدرے گڑبڑا کر اس کی جانب دیکھا "گھر کا؟ کیا مطلب؟"
"تم نے مجھے میرے گھر کے قریب چھوڑا تھا۔"
"جس گیٹ کے قریب میں نے تمہیں چھوڑا وہ تمہارا گھر تھا۔"
"ہاں!"
خرم نے نفی میں سر ہلا دیا "مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ تمہارا گھر ہے۔"
"گھر چلو گے میرے ساتھ؟" وہ ایک دم چہک کر بولی۔
"نہیں نہیں پھر کبھی ابھی مجھے ایک کام یاد آگیا ہے۔ میں چلتا ہوں کل آؤں گا اوکے خدا حافظ۔" اتنا کہہ کر وہ تیزی سے اٹھا اور وہاں سے چلا گیا۔ سمل محض شانے اچکا کر رہ گئی۔ "عجیب شخص ہے یہ بھی' اچانک ہی دو گھنٹے بعد کون سا کام یاد آگیا۔" وہ اٹھی اور گھر کی طرف چل دی۔

☼ ☼ ☼

ہوا کے سرد جھونکے اس کے چہرے سے ٹکراتے ہوئے اس کے بالوں کو بار بار رخسار پر بکھیر رہے تھے' اور وہ کافی دیر سے خاموش بیٹھا محویت کے عالم میں اس کو تک رہا تھا۔
"خرم! تم آج تو میرے گھر چلو میں پچھلے ایک ہفتے سے روز تمہیں گھر چلنے کا کہتی ہوں' مگر ہر دفعہ تم ٹال دیتے ہو کیوں؟"
"ارے میں نے کب ٹالا ہے۔ میں تو ویسے ہی....." اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔
"بس تم آج میرے گھر چل رہے ہو۔" سمل کا لہجہ حتمی تھا۔
"اوکے باس! جیسے آپ کا حکم۔" وہ خوش دلی سے مسکرا دیا۔

صدر دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے سمل جہانگیر' خرم کے چہرے پر موجود الجھن دیکھ نہ پائی تھی۔ لاؤنج میں دیوار پر سلور فریم میں نصب ماہ نور کی تصویر کو وہ چند سیکنڈ غور سے دیکھتا رہا' پھر سر جھٹک کر سمل کے پیچھے چل دیا جو اسے اپنے کمرے کی طرف لے کر جا رہی تھی۔
"یہ ہے میرا کمرہ اور ادھر۔" اس نے کمرے سے ملحقہ دروازہ کھول دیا "ادھر میری اسٹڈی ہے۔"
وہ حیرانی سے کتابوں سے بھری لائبریری کو دیکھ رہا تھا "واؤ تم نے ان میں سے کتنی پڑھ رکھی ہیں؟"
اس کے استفسار پر سمل نے قدرے شرمندہ ہو کر کہا "تقریباً" ساری۔"
"تم تو بڑے کام کی لڑکی ہو بھئی۔" وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔
پھر کتنی ہی دیر وہ دونوں مختلف کتابیں دیکھتے اور ان پر تبصرہ کرتے رہے۔ وقت بہت اچھا گزر رہا تھا اکٹھے بیٹھ کر ہنسنا' باتیں کرنا۔ وہ سمل کی زندگی کے خوب صورت ترین لمحات تھے۔
بٹلر چائے کے ساتھ کافی سارے لوازمات لے کر آیا تھا' مگر خرم نے کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا۔
"چائے میں پیتا نہیں' اور بیکری والی چیزیں مجھے پسند نہیں۔" اس نے سمل کے پر زور اصرار کو نہایت خوب صورتی سے یہ کہہ کر مسترد کر دیا۔
ایک دم ہی دروازہ کھلا اور وہ ہمیشہ کی طرح اندر آتے ہی اونچی آواز میں بولی "سمل' وہ میگزین جو میں نے ادھر۔" نووارد کو دیکھ کر ماہ نور ایک دم ٹھٹک کر رک گئی۔
"تم؟" اس نے حیرانی سے خرم کی جانب دیکھا جو اس پر ایک ناپسندیدہ سی نگاہ ڈال کر استفہامیہ نظروں سے سمل کو دیکھ رہا تھا۔
"ماہ نور! یہ میرے فرینڈ ہیں' خرم زید اور خرم..... یہ ماہ نور ہے میری بہن۔"
خرم نے نہایت شائستگی سے سر ہلا کر رسمی کلمات کہے' مگر ماہ نور مسلسل اس کو تکے جا رہی تھی۔
"مجھے نہیں پتا تھا کہ آپ اسلام آباد میں رہتے ہیں۔" بالآخر نور نے مسکرا کر کہا۔
سمل نے حیرانی سے نور کو دیکھا۔ "آپ دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟"
"ہاں کیوں نہیں میں ان سے مل چکی ہوں کیوں خرم؟" وہ خوش دلی سے بولی۔
"ایکسکیوز می مس! میں آپ سے پہلی دفعہ مل رہا ہوں۔" وہ قدرے سخت لہجے میں بولا ماہ نور کا چہرہ ایک دم دھواں دھواں ہو گیا۔
"لیکن وہ مالم جبہ کے ہوٹل میں آپ ہی تھے نا۔" وہ

بمشکل بولی۔
خرم نے چند ثانیے کو سوچا' پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ "مجھے یاد نہیں آئی ایم سوری۔"
سمل نے قدرے چونک کر نور کی جانب اور پھر خرم کی جانب دیکھا۔ ماہ نور ہرگز ایسی لڑکی نہ تھی جو بھلائی جا سکتی۔ کیا خرم کو واقعی یاد نہیں تھا یا وہ بن رہا تھا۔ جس لمحے ماہ نور کمرے میں داخل ہوئی تھی' سمل نے خرم کے چہرے پر واضح ناگواری کی لہر دیکھی تھی۔
سمل نے ماہ نور کو دیکھا۔ احساس توہین سے اس کے کان کی لوئیں سرخ ہو گئی تھیں۔ اس نے غصے سے خرم کو گھورا پھر بولی "تم بہت اچھے ایکٹر ہو۔"
"میں چلتا ہوں تم۔" اس نے سمل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم اپنی بڑی بہن کا غصہ ٹھنڈا کرواؤ کے اللہ حافظ۔" وہ سمل کے الوداعی کلمات کا انتظار کیے بغیر ہی تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔
"ایڈیٹ!" وہ بڑبڑائی۔

☼ ☼ ☼

اگلے دو دن وہ خرم سے مل سکی نہ ہی ماہ نور سے اس کا سامنا ہوا۔ وجہ ڈیڈ کی ناساز طبیعت تھی۔ وہ اچانک ہی دبئی سے لوٹ آئے تھے اور سخت بخار و سردرد میں مبتلا تھے۔ مسلسل دو دن تک سمل ان کی تیمارداری کرتی رہی' مما کسی چیریٹی شو میں شرکت کرنے کے لیے کراچی گئی ہوئی تھیں۔ اور رہی ماہ نور تو وہ کب آتی کب جاتی۔ سمل کو خبر نہ تھی۔
وہ صبح چائے لے کر ان کے کمرے میں آئی تو ایٹرنٹی کی خوشبو فوراً" ناک سے ٹکرائی۔ وہ فل سائز ڈریسنگ مرر کے سامنے کھڑے اپنے کالر درست کر رہے تھے۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر انہوں نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا اور مسکرائے۔
"ڈیڈ؟" سمل نے پلکیں جھپکائیں "آپ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہے ہیں؟"
انہوں نے ٹائی کی ناٹ باندھتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔
"کم آن ڈیڈ۔" وہ کرسی پر بیٹھ گئی' بیساکھی ساتھ رکھی اور چائے کی پیالی ان کو تھما دی "اگر آپ آج آفس نہیں جائیں گے تو کون سی قیامت آجائے گی؟"
"میں کماؤں گا نہیں تو آپ کھاؤ گے کہاں سے؟" انہوں نے ہمیشہ کی طرح کہا۔
"مگر ڈیڈ! لوگ تو کہتے ہیں سینیٹر جہانگیر کے پاس اتنی دولت ہے کہ سات پشتیں بھی بیٹھ کر کھا سکتی ہیں۔"
"تو پھر آٹھویں پشت کیا کرے گی؟"
"آٹھویں پشت کے بجائے آپ اپنی فکر کریں۔ آپ کی طبیعت آج ہی کچھ سنبھلی ہے اور....."
"سمل بیٹا! میں نے اپنے پاؤں آل ریڈی کافی گہری دلدل میں پھنسا رکھے ہیں مجھے بہت سارے معاملات دیکھنے ہوتے ہیں۔ اگر میرا ایک قدم بھی اکھڑ گیا تو یہ سب ختم ہو جائے گا۔" انہوں نے سر جھٹکا "مگر تم نہیں سمجھ سکتیں۔ کبھی ماہ نور سے پوچھنا' وہ تمہیں تفصیل سے سمجھائے گی۔"
ہاں سمل تو بچپن سے ہی نا سمجھ اور بے وقوف تھی مگر ماہ نور کی تو کیا ہی بات تھی۔ سمل کو ہمیشہ سے ہی یہ سب سننے کی عادت تھی۔
اس نے ڈیڈ کی جانب دیکھا وہ کہہ رہے تھے "میں بزنس میں اتنی محنت تب چھوڑوں گا جب ماہ نور یہ سب کچھ سنبھالے گی۔"
یہ بات بچپن سے ہی پورے گھر بلکہ آدھے اسلام آباد کو معلوم تھی کہ "سینیٹر جہانگیر کی چھوٹی بیٹی ماہ نور جہانگیر ان کا بزنس سنبھالے گی۔"
جہانگیر صاحب جا چکے تھے۔ اس نے چائے کا کپ اٹھا لیا انہوں نے چائے نہیں پی تھی۔
وہ کمرے سے باہر نکل کر کچن کی طرف جا رہی تھی جب اس نے ماہ نور کی آواز سنی۔ وہ سن روم سے نکل کر اس کی طرف آ رہی تھی۔ سمل نے کپ قریب سے گزرتے بٹلر کو تھما دیا اور اس کی جانب دیکھنے لگی۔
"سمل! مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنا ہے۔"
"ہاں بولو۔" وہ وہیں لاؤنج میں ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔ ماہ نور اس کے مقابل آ کر بیٹھ گئی "مجھے خرم کے بارے میں بتاؤ۔"
"اس کے بارے میں کیا بتاؤں؟" سمل نے اس اچانک افتاد پر قدرے بوکھلا کر ماہ نور کو دیکھا۔
"تم اسے کیسے جانتی ہو؟"
"میں اس سے پارک میں ملی تھی۔" دھیرے دھیرے اس نے ماہ نور کو ساری بات بتا دی۔

"اوہ تو یہ بات ہے۔" ماہ نور بمشکل مسکرائی "تمہیں وہ اچھا لگتا ہے؟"

سمل نے نگاہیں میز پر رکھے کرسٹل کے گلدان پر مرکوز کر دیں۔

ماہ نور کو ایک دم ہی اپنی معمولی شکل و صورت والی بہن بہت حسین لگی۔ اتنی حسین کہ اس کے حسن کے آگے ماہ نور کو اپنا وجود کمتر محسوس ہونے لگا۔ سمل کے گندمی رنگ پر بچی خوشی کی ایک لہر نے ہی کتنی رونق سجا دی تھی۔

چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ اور دل میں کینہ بھرے وہ سمل سے مخاطب تھی۔

"کیا تمہیں اس سے محبت ہو گئی ہے؟"

"پتہ نہیں مگر مجھے وہ اچھا لگتا ہے۔"

"بہت دور کی مت سوچنا وہ آل ریڈی کسی کے ساتھ کمٹڈ ہے۔"

سمل نے سر اٹھا کر حیرانی سے اس کو دیکھا۔

"میں جب مالم جبہ گئی تھی تو اس کو وہاں دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ شاید کوئی...." ماہ نور بظاہر لاپروائی سے کہتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔

اس کے جانے کے کافی دیر بعد تک سمل وہیں صوفے پر گم صم بیٹھی رہی۔

"تو کیا اس کی زندگی میں میرے علاوہ کوئی اور لڑکی بھی ہے جو اس کے ساتھ مالم جبہ تک گئی تھی۔ اوہ میں بھی کتنی بے وقوف ہوں، جو دوستی جیسے جذبے کو محبت کے ساتھ مشروط کر بیٹھی۔ اگر اس کی زندگی میں کوئی اور لڑکی ہو بھی تو مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ اس کی زندگی میں ہزار لڑکیاں آئیں یا جائیں، میری صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔"

اپنے آپ کو دلیلیں دینے کے باوجود بھی اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگ گئے۔

سمل نے چہرے سے بال ہٹائے اور میز پر رکھا کیچر اٹھا کر انہیں سختی سے اس میں کس دیا۔



بیساکھی کے سہارے اپنے غیر ضروری وجود کو گھسیٹتی ہوئی وہ پارک میں داخل ہوئی تو ہمیشہ کی طرح خرم کو سنگی بنچ پر بیٹھے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک کھلا ہوا گلاب تھا، جسے وہ بے چینی کے عالم میں دونوں ہتھیلیوں کے درمیان گھما رہا تھا۔ سمل کے چہرے پر نظر پڑتے ہی اس کی آنکھوں میں دیے جل اٹھے۔

"سمل!" وہ مسکرایا۔ اس کی دلنشین مسکراہٹ اس کے چہرے کے نقوش کو مزید خوب صورت بنا دیتی تھی۔

"کیسی ہو؟" وہ دھیرے سے بولا۔

"ٹھیک ہوں۔" عام سے لہجے میں کہتی ہوئی وہ اس کے برابر آن بیٹھی۔

خرم نے ایک ساعت کو اس کے چہرے کو بغور دیکھا، پھر نگاہیں اس کے بالوں پر پھسل گئیں جنہیں اس نے کھلے جوڑے کی شکل میں باندھ رکھا تھا۔ وہ چند لمحے یونہی اس کو پُرسوچ نگاہوں سے دیکھتا رہا، مگر بولا کچھ نہیں۔

"کیا سوچ رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

وہ ہولے سے مسکرایا "ماہ نور تمہاری چھوٹی بہن ہے کہ بڑی بہن؟"

وہ اس سوال پر کافی حیران ہوئی اسے یاد آیا کہ دو روز پہلے جاتے سمے خرم نے اس سے کہا تھا کہ وہ اپنی "بڑی بہن" سے کہے غصہ ٹھنڈا کرے۔

"وہ چھوٹی ہے۔"

خرم کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔ "میری چھوٹی بہن اگر مجھ سے غلط بیانی کرے تو میں رکھ کر ایک لگا دوں ایک تم ہو کہ....."

"کہ کیا؟" وہ کچھ الجھ کر بولی۔

"کچھ نہیں۔" وہ ہنسا اور سر جھکا لیا۔ سمل کو اس کی ہنسی بہت تلخ لگی تھی۔

"بتاؤ کیا کہہ رہے تھے؟" خرم نے سر اٹھایا۔

"سچ سچ بتانا سمل! تمہیں ماہ نور نے میرے متعلق کیا کہا ہے؟"

وہ اپنے آپ کو کل سے جو سبق دے رہی تھی، اس ڈھلتی شام کو سنگی بنچ پر خرم کے قریب بیٹھے، وہ سبق اس کو بھول گیا۔ اس نے اپنے آپ کو کہتے سنا۔

"وہ لڑکی جو تمہارے ساتھ مالم جبہ میں تھی، وہ کون تھی؟"

اپنے اندازے کی یقین دہانی پر وہ جی بھر کر ہنسا، پھر بولا۔

"چلو تمہارے گھر چلتے ہیں ماہ نور ہو گی نا گھر پر؟"

"میں آئی تھی تو وہ لان میں بیٹھی تھی۔ اب بھی ہو گی شاید۔" سمل اٹھتے ہوئے بولی۔

ماہ نور گھر پر ہی تھی، البتہ لان کے بجائے لونگ روم میں

بیٹھی فون پر کسی سے باتیں کر رہی تھی۔ ان دونوں کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر وہ ایک دم چونکی' پھر ایک مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا احاطہ کر لیا۔ فون بند کر کے وہ اٹھی اور نہایت خوش دلی سے خرم کا استقبال کیا۔

وہ دونوں اکٹھے ہی صوفے پر بیٹھ گئے جبکہ ماہ نور اپنی پسندیدہ چیئر پر براجمان ہو گئی۔ سی گرین اور ایکوا کلر کے فنڈ بلاؤز اور ٹخنوں سے کافی اوپر تک آنے والی جینز میں ملبوس وہ ہمیشہ کی طرح خوب صورت لگ رہی تھی۔

"سمل آپ کی بہت تعریفیں کرتی ہے۔" خرم نے اپنے چہرے پر ایک دلنشین مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔

جواب میں ماہ نور کھلکھلا کر ہنس دی۔ اس کے ہنسنے کے انداز نے اس کے حسن کو ایک دم ہی کتنا کم کر دیا تھا۔

"کیا کرتی ہیں آپ؟"

"لائف انجوائے کرتی ہوں' کالج تو میں پچھلے دو ڈھائی مہینے سے گئی نہیں اب دوستوں کے ساتھ گھومتی ہوں۔ سوئمنگ' رائیڈنگ' ٹینس اور سیر اس کے علاوہ میں اسکائنگ ایکسپرٹ بھی ہوں۔" وہ فخریہ لہجے میں بولی۔

"اوہ!" خرم نے تاسف انگیز لہجے میں کہا۔ "بڑی کافی بے مقصد زندگی ہے آپ کی' میں تو سمجھا تھا آپ سمل کی طرح پڑھی لکھی اور کافی قابل لڑکی ہوں گی' مگر آپ بھی ہر بگڑی بچی کی طرح اپنے آپ کو ضائع کر رہی ہیں' سمل! تم سمجھاتی کیوں نہیں ہو اپنی بڑی بہن کو؟"

"سمل میری بڑی بہن ہے' میں چھوٹی ہوں۔" ماہ نور نے تڑخ کر کہا۔

"سمل بڑی ہے؟" خرم نے یوں ظاہر کیا جیسے اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹے ہوں۔ "مگر شکل سے تو آپ بڑی لگتی ہیں۔"

پھر وہ سمل کی طرف مڑا اور اس کا چہرہ بغور دیکھا۔

"سمل کے چہرے پر کافی معصومیت اور سادگی ہے جبکہ آپ کے چہرے....."

وہ ماہ نور کو بولنے کا موقع دیے بغیر ہی بے لاگ تبصرے کیے جا رہا تھا۔ "میں تو یہی سمجھتا رہا کہ سمل آپ سے چھوٹی ہے مگر خیر چھوڑیں اور ہاں سمل!" وہ اس سے مخاطب ہوا "تم کس لڑکی کا پوچھ رہی تھیں؟"

"کب؟"

"ابھی پارک میں تم کسی لڑکی کا پوچھ رہی تھیں جو مالم جبہ میں تھی؟"

ماہ نور کے چہرے کا رنگ ایک دم متغیر ہو گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کا جھوٹ اتنی جلدی [illegible] جائے گا۔

"خرم! وہ دراصل جو لڑکی مالم جبہ میں آپ کے ساتھ تھی' وہ کون تھی؟" سمل دھیرے سے بولی۔

"میرے ساتھ؟" وہ مزید حیران ہو گیا۔ "بھئی میں اپنی یونیورسٹی کے دوستوں کے ساتھ مالم جبہ کے ٹور پر گیا تھا' میرے ساتھ تو کوئی لڑکی نہ تھی۔ ماہ نور! آپ وہاں پر موجود تھیں۔ آپ نے بھلا کسی لڑکی کو میرے ہمراہ دیکھا تھا؟"

"نن نہیں' آپ اکیلے تھے۔" ماہ نور نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

سمل کو یاد آیا کہ پچھلی ملاقات میں خرم نے یہ ماننے سے ہی انکار کر دیا تھا کہ وہ ماہ نور سے ملا تھا اور اب وہ اس بات کا اقرار کر رہا تھا۔

"سن لو میں اکیلا تھا۔ تمہیں کس نے یہ انفارمیشن پہنچائی تھی؟" وہ سمل سے جرح کرنے کے موڈ میں تھا۔

"نور نے ہی کہا تھا۔"

"وہ تو میں نے مذاق کیا تھا۔ سمل بھی نا بس اتنی سی عقل ہے اس میں۔ اس سے تو مذاق ہی نہ کیا جائے تو بہتر ہے۔" اپنی شرمندگی چھپانے کے لیے ماہ نور نے سارا ملبہ سمل پر گرانے کی کوشش کی۔

"ایکسکیوزمی مس ماہ نور جہانگیر!" وہ تنبیہہ کرتے ہوئے بولا "آپ اپنی بہن سے کسی اور کے متعلق ازراہ مذاق کچھ بھی کہہ دیں' مگر اپنی ذات پر ایک لفظ بھی میں برداشت نہیں کرتا' سمجھیں آپ؟" وہ سخت لہجے میں بولا۔

ماہ نور نے کچھ کہنے کے لیے لب وا کیے' مگر اس سے پہلے ہی وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ "میں چلتا ہوں۔ کال کروں گا۔" وہ سمل کو مخاطب کر کے بولا اور نکل گیا۔

نور' سمل کو جرح کا موقع دیے بغیر ہی وہاں سے اٹھ کر جا چکی تھی۔ ان دونوں کے جانے کے بعد کافی دیر تک وہ وہاں بیٹھی کچھ سوچتی رہی۔



"تم اپنی بہن سے اتنا ڈرتی کیوں ہو؟"

"میں ڈرتی تو نہیں ہوں۔" وہ برا مانے بغیر بولی۔

"تم ڈرتی ہو اس سے' مان جاؤ۔" وہ اسے چھیڑنے لگا۔

"ڈرتی تو نہیں ہوں' بس میں' میں۔" وہ خاموش ہو گئی تو خرم نے اس کا جملہ مکمل کر دیا۔ "بس تم اس سے متاثر ہو۔" سمل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"کیوں؟"

"کیونکہ وہ بہت اچھی ہے۔" سمل نے اپنے تئیں ایک ٹھوس دلیل دی۔

"ہونہہ! کہیں سے بھی نہیں' میں نے اپنی پوری زندگی اتنی فضول لڑکی نہیں دیکھی۔"

"فضول' نہیں تو' اس میں بہت سی خوبیاں ہیں۔"

خرم نے آستینیں چڑھالیں "تم ذرا اس کی خوبیاں گنواتی جاؤ۔"

"وہ بہت پریٹی ہے۔"

"اس میں چالیس فیصد کمال اللہ تعالیٰ کا' پچاس فیصد ڈیلی ایکسرسائزز' مینی کیور' فیشل' پیڈی کیورز' مساج وغیرہ کا ہے اور دس فیصد میک اپ کا اس کا اپنا تو کوئی کمال نہیں ہے۔"

"وہ بہت سمجھ دار ہے۔"

"چالاک کہو۔" وہ نخوت سے بولا۔

"وہ میری بہن ہے اور بہت اچھی ہے۔"

"وہ تم سے جلتی ہے۔ کافی حاسد مزاج ہے تمہاری بہن"

سمل کو حیرت ہوئی۔ حاسد مزاج! جلتی ہے؟ وہ بھی مجھ سے؟ نہیں میرے پاس کیا ہے' جس سے وہ جلے؟"

"تمہیں اپنے ادھورا ہونے کا اتنا کمپلیکس نہیں ہے جتنا اپنی شکل کا ہے۔ تم سمجھتی ہو' وہ بہت خوب صورت ہے تو وہ بہت سپریر ہے اور تم بقول تمہارے بدصورت ہو تو تم کم ہو گئی۔ میرے نزدیک تو تم دنیا کی حسین ترین لڑکی ہو۔ پلیز سمل! دنیا کو فیس کرنا سیکھو۔ اپنے آپ کو چینج کرو۔ تم خود کو اہم سمجھو گی تو دوسروں سے اپنی اہمیت منوا سکو گی۔"

"تم آج بہت ہینڈسم لگ رہے ہو؟" اس کی تقریر کا یہی جواب تھا سمل کے پاس۔

"میں ہینڈسم نہیں ٹھیک ہی ہوں' بہت سی خامیاں' کمزوریاں مجھ میں بھی ہیں۔"

"تم بہت مشکل باتیں کرتے ہو میرے سر پر سے گزر جاتی ہیں۔ کبھی کوئی آسان بات بھی کیا کرو۔" وہ احتجاجاً بولی۔

"زندگی میں آسانیاں ان لوگوں کو ملتی ہیں جو منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ ہم جیسے چودہ گریڈ کے افسروں کے بچوں کو نہیں۔" وہ تلخ لہجے میں بولا "میرے ابا نے ساری زندگی ایمان داری سے کام کیا۔ کبھی ہمارے منہ میں حرام کا رزق نہیں ڈالا۔ اب ان کی وفات کے بعد ہمیں ان کی پنشن کا جائز روپیہ بھی نہیں مل رہا۔ میں صرف ایم بی اے ہوں' Lums کا نہیں بلکہ ایک عام سے ادارے کا' بھلا مجھے کون جاب دے گا۔ اگر میں اکیلا ہوتا تو اور بات تھی' مگر مجھ سے چھوٹی پانچ بہنیں اور بھی ہیں' جن کی شادیاں بھی مجھے ہی کرنا ہیں۔ جبکہ میرے پاس تو اتنی رقم بھی نہیں ہے کہ....." بولتے بولتے اس کا سانس پھول گیا تھا وہ مصلحتاً خاموش ہو گیا۔

"تم نے پہلے تو کبھی نہیں بتایا کہ اتنے مسائل کا شکار ہو۔ اچھا یہ بتاؤ کہ فی الحال تمہارے پاس کوئی جاب ہے کہ نہیں؟"

"نہیں۔" خرم نے سر جھکا لیا۔

"تمہارا میجر سبجیکٹ کیا تھا؟" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"ہوٹل مینجمنٹ مگر کیوں؟"

"پھر تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ڈیڈ کے کئی بزنس ہیں۔ وہ ہوٹلز کے بزنس میں بھی ہیں۔ میں ڈیڈ سے بات کرتی ہوں۔ تمہیں ان کے کسی بھی ہوٹل پر آسانی سے اچھی جاب مل جائے گی۔"

"سفارش؟"

"کیا؟" وہ حیرانی سے اس کو دیکھنے لگی۔

"سوری میں شارٹ کٹ پر بھروسہ نہیں کرتا۔ مجھے سفارش والی جاب نہیں چاہیے۔" اس نے سر جھٹکا۔

"تم غلط سمجھ رہے ہو میں یہ نہیں کہہ رہی کہ میں تمہیں ڈائریکٹ جنرل منیجر لگوا دوں گی ڈیڈ میرٹ پر جاب دیتے ہیں۔ میں ان سے بات کروں گی کہ....."

"تم اس بات کو چھوڑو۔ مجھے کسی کا فیور نہیں چاہیے۔ مجھے اپنے آپ پر بھروسا ہے۔ میں محنت کر سکتا ہوں۔"

"تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"میں بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں میں ہوٹلز کے بزنس کا گاڈ فادر بننا چاہتا ہوں۔" وہ پرعزم لہجے میں بولا۔

"تم کیوں زبننا چاہتے ہو؟ تم دنیا میں بائیس ہزار ہالیڈے ان کھولنا چاہتے ہو؟"

"نہیں میں چاہتا ہوں لوگ کل کے نوجوان سے پوچھیں کہ تم خرم زید بننا چاہتے ہو؟" میں سو ہوٹلز کی ایک چین بنانا چاہتا ہوں میں دنیا فتح کرنا چاہتا ہوں۔" اس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی۔

"خرم تمہیں پتا ہے تمہارے آنکھوں میں کیا ہے؟"

"کیا؟"

"تمہاری آنکھوں میں جگنو ہیں۔ جانتے ہو یہ جگنو کیا ہوتے ہیں؟ یہ امید کے دیے ہوتے ہیں۔ یہ بند گلی میں دریچے کھول دیتے ہیں' یہ اندھیرے میں روشنی کی شمع جلاتے ہوئے مسافروں کو راستہ دکھاتے ہیں اور اندھی سڑک کے مسافروں کو ان کی بہت ضرورت ہوتی ہے۔ پتہ ہے اندھی سڑک کے مسافر کون ہوتے ہیں؟ وہ لوگ جو محبت کی راہ پر چلتے ہوئے اپنے خواب تلاش کرتے ہیں۔ تمہارے بہت سے خواب ہیں۔ میرے بھی بہت سے خواب ہیں۔"

اس نے سامنے بہتی جھیل کو دیکھا۔

"میرا دل کرتا ہے ایک جزیرہ ہو بالکل الگ تھلگ وہاں اور کوئی نہ ہو۔ اس پر بہت بڑے بڑے پام کے درخت ہوں اور ان میں گھرا ایک بہت خوب صورت سا ہٹ ہو' باہر ایک لکڑی کا سائن بورڈ لگا ہوا ہو جس پر لکھا ہو فار سمل مائی لو اور کوئی ایسا شخص ہو' جو مجھے وہ سب کچھ دے جو میں چاہتی ہوں اس میں ہم دونوں رہیں بس یہی خواب ہے میرا۔"

"سمل!" خرم نے دھیرے سے اسے پکارا "اگر میں تمہارے خواب پورے کردوں تو؟"



یہ احساس ہی کتنا خوشگوار ہوتا ہے کہ کوئی آپ سے محبت کرتا ہے' پوری دنیا میں سب سے زیادہ آپ کو چاہتا ہے' اور آپ کے ساتھ زندگی گزارنے کا خواہش مند ہے اور اس شخص کو آپ بھی بالکل ویسے ہی چاہتے ہوں۔

ایک دم ہی زندگی اتنی خوب صورت لگنے لگی تھی۔ لگتا تھا ہر طرف بہار آگئی ہو' ہر سو پھول کھل گئے ہوں۔ نرم نرم گھاس جو شبنم کے موتیوں سے لبریز ہو اس پر ننگے پاؤں چلنے میں جو مزہ ہے' جو لذت ہے بالکل ویسا ہی "احساس" اس کو محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ ٹھنڈے میٹھے پانی کے چشمے کے بالکل قریب بیٹھی ہو' یا پھر پھولوں بھرے رستے پر چل رہی ہو۔

حالانکہ یہ صرف دو روز پہلے کی بات تھی جب خرم نے اس سے اظہار محبت کیا تھا بلکہ باقاعدہ پرپوز کیا تھا۔ اس لمحے اس کو اپنا وجود ناکارہ اور غیر ضروری نہیں لگا تھا' بلکہ اس کو تو اپنا آپ بہت اہم لگا تھا۔ جیسے وہ دنیا کی سب سے حسین لڑکی ہو۔ اس کو اس کی محبت مل گئی تھی۔ اس کا ڈار سی مل گیا تھا۔

ڈار سی کا نام ذہن میں آتے ہی اس کو اپنی اور خرم کی ڈیڑھ ماہ پہلے ہونے والی ملاقات یاد آگئی۔ وہ بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

اسی لمحے دروازہ کھول کر ماہ نور اندر داخل ہوئی تھی۔ وہ پہلے تو سمل کو ہنستے دیکھ کر ٹھٹھکی' پھر جلدی سے دروازہ بند کرکے اس کے قریب آبیٹھی۔

"سمل!" وہ مناسب الفاظ تلاش کرنے لگی "مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔"

"ہاں کہو۔" سمل کو وہ مضطرب اور بے چین لگی تھی۔

"مجھے تم سے خرم کے متعلق بات کرنی ہے۔"

"کیا بات؟"

"وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے؟"

"ہاں!"

"مگر اس کے پاس کوئی نوکری نہیں ہے۔"

"ہاں۔"

"نہ ہی کوئی بزنس؟"

"ہاں۔"

"تو کیا ڈیڈی اس کو قبول کرلیں گے؟"

"ہاں۔" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

"سمل! میں تمہیں ہرٹ نہیں کرنا چاہتی' مگر میرے خیال میں وہ محض اپنا مستقبل بنانا چاہتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" سمل چونکی۔

"وہ کہہ رہا تھا کہ اسے تم سے لو ایٹ فرسٹ سائٹ ہوا تھا۔ پہلی نظر کی محبت' ہیلن آف ٹرائے یا انجلینا جولی یا جولیا رابرٹس سے تو ہوسکتی ہے مگر......" ماہ نور خاموش ہوگئی۔

"لیکن مجھ جیسی کم شکل اور اپاہج سے نہیں۔" سمل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"سمل! وہ غریب ہے' اسے اپنی بہنوں کی شادی کرنا

ہے اور اس صورت میں اسے کسی ایسی لڑکی کا سہارا چاہیے جو' جو بہت امیر ہو' ایسی لڑکی جو اس کے لیے سیڑھی بن سکے جو لوگ عقل سے دولت حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کو ہمیشہ ایک ایسے زینے کی تلاش رہتی ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ تمہیں مجھ سے دور کر رہا ہے۔ وہ تمہیں میرے خلاف بھڑکاتا ہے۔ مجھے پتا ہے میں کوئی بہت اچھی بہن نہیں ہوں' مگر بہن تو ہوں! مجھے اس سارے معاملے سے خطرے کی بو آرہی ہے۔"

ماہ نور بول رہی تھی مگر سمل ساکت بیٹھی خلاؤں میں گھور رہی تھی کیا خرم ایسا ہو سکتا ہے؟ اتنا گھٹیا انسان؟ نہیں! میرا خرم ایسا نہیں ہوسکتا۔ ہرگز نہیں ماہ نور جلتی ہے' جھوٹ بولتی ہے۔" وہ اپنے آپ کو تسلیاں دینے لگی مگر دل میں اچانک پھیل جانے والی ہلچل اسے پریشان کر رہی تھی۔

ماہ نور بھی خاموش ہوگئی تھی۔ حقیقت کیا تھی' وہ دونوں اس سے بے خبر تھیں لیکن یہ بے خبری سمل کی زندگی کا رخ موڑ سکتی تھی۔ وہ ایک ایسے موڑ پر کھڑی تھی جہاں سے آگے کا منظر غائب ہوگیا تھا ہر سو دھند پھیلی ہوئی تھی اور اس دھند میں اس کے جگنو گم ہوگئے تھے۔

"سمل ہو سکتا ہے میں غلط کہہ رہی ہوں ہو سکتا ہے وہ واقعی اچھا آدمی ہو۔" ماہ نور نے تذبذب کے عالم میں کہا۔

"لیکن مجھے کیسے پتہ چلے گا" وہ بمشکل بول پائی۔

"تم اس کا امتحان لو اسے جانچو پرکھو۔"

"مگر کیسے؟"

"ایک طریقہ ہے۔ تم اس کو بلاؤ اور......" ماہ نور اپنی اپاہج بہن کے قریب ہو کر اسے دھیرے دھیرے آئندہ کا لائحہ عمل سمجھانے لگی۔



وہ 17 مارچ 1997ء کی ایک بہت سوگوار شام تھی۔ اس کی دروازے کی طرف پشت تھی۔ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی تھی۔ وہ یہ دستک پہچانتی تھی' مگر دستک دینے والے کو صحیح طور پر نہیں پہچانتی تھی۔

دروازہ دھیرے سے کھلا تھا۔ خرم کی مخصوص خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکراتی ہوئی اس کی موجودگی کا پیغام دینے لگی۔

اس لمحے سمل کا دل بھٹکنے لگا۔ اسے ماہ نور کی باتیں جھوٹ لگنے لگی تھیں۔ بھلا خرم جیسا بندہ اس کے ساتھ ایسے کیوں کرے گا؟ وہ تو اتنا اچھا' اتنا سوئیٹ ہے۔ کیا ضروری ہے وہ لالچی ہو' ہو سکتا ہے اسے واقعی مجھ سے محبت ہو۔

ہونہہ.... ایک کم شکل اور اپاہج لڑکی سے محبت؟ وہ بھی پہلی نظر کی؟ کوئی جیسے اس کے اندر ہنسا تھا۔

"السلام علیکم!" اسے اپنی پشت پر خرم کی آواز سنائی دی۔

"وعلیکم السلام!" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ "خیریت تم نے مجھے یہاں کیوں بلوایا؟"

"ہاں۔" اسی لمحے اس نے فیصلہ کرلیا۔ ماہ نور کو غلط فہمی ہوئی ہوگی' مگر پھر بھی اس کی تسلی کے لیے میں اس کو ضرور آزماؤں گی۔ "خرم! میں نے تمہارے پروپوزل پر بہت سوچا' اور اب مجھے ایک ہی حل نظر آتا ہے۔"

"کیا؟"

"میں تم سے شادی کے لیے تیار ہوں' مگر میری ایک شرط ہے۔"

"کیسی شرط؟" اس کے لہجے میں گہری الجھن تھی۔

"میری شرط یہ ہے کہ میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر میں رہوں گی میرا مطلب ہے میں ڈیڈ کی دولت میں سے ایک پیسہ بھی نہیں لوں گی۔ نہ ہی کسی قسم کا جہیز لوں گی۔ میرے حصے کی دولت میرے ڈیڈ کے پاس ہی رہے گی اور میرے مرنے کے بعد وہ ایک ٹرسٹ کے نام ہوجائے گی۔ میں تمہارے ساتھ تمہاری غربت میں گزارا کرنے کو تیار ہوں لیکن جس طرح ڈیڈ کی جائیداد پر میرا کوئی حق نہیں' اس طرح تمہارا بھی کوئی حق نہیں ہوگا میں تمام عمر تمہارے ساتھ اس چھوٹے سے گھر میں گزارا کرنے کو تیار ہوں' خرم زید! اگر تمہیں میری شرط منظور ہے تو بتاؤ؟"

اس نے یہ سب کچھ کہہ تو دیا مگر اسے معلوم تھا کہ خرم کا جواب کیا ہوگا؟ وہ کہے گا۔

"کم آن سمل! ہمیں کچھ نہیں چاہیے یا مجھے تمہاری دولت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔" وہ مطمئن سی ہوکر بیٹھ گئی۔

چند لمحے وہاں خاموشی چھائی رہی' پھر اس کی گمبھیر آواز نے ماحول کے سکوت کو توڑا۔

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟"

"ہاں!" وہ بولی "اگر تمہیں منظور ہے تو بتاؤ ورنہ......"

"ورنہ کیا؟" خرم نے جیسے اسے چیلنج کیا۔

"ورنہ الوداع اگر تمہیں منظور نہیں تو تم یہاں سے جا سکتے ہو۔" اسے پورا اعتماد تھا اپنی چاہت پر' سمل کو اصل دھچکا اس وقت لگا جب خرم کے الفاظ اس کی سماعت سے ٹکرائے۔

"کاش تم یہ فضول کی ضد نہ کرتیں تو ہم دونوں کی زندگی بن سکتی تھی۔ مگر چونکہ یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے اور بالکل غلط ہے اس لیے۔" وہ رکا اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر بولا "اس لیے سمل جہانگیر الوداع۔"

وہ یہ کہہ کر رکا نہیں بلکہ مڑا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ سمل نے اس کے جانے کا انتظار کیا اور جب اس کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ گھر سے جا چکا ہے تو وہ اٹھی اور بیساکھی کے سہارے چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل آئی اس کا رخ کچن کی جانب تھا۔

کچن میں پہنچ کر اس نے ادھر ادھر دیکھا وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ اطمینان سے چلتی ہوئی کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی اور بیساکھی دوسری کرسی کے سہارے ٹکا دی۔

اسے پتا تھا اسے کیا کرنا ہے۔ وہ کام جو اسے بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔ مگر کوئی بات نہیں' ابھی اتنی دیر نہیں ہوئی تھی۔

اس نے میز کے عین وسط میں رکھے اسٹینڈ سے سب سے تیز دھار والا چاقو اٹھایا اور نہایت بے دردی سے اپنی کلائی کی رگ کاٹ دی۔



کرنسی نوٹ گن کر اس نے ڈیسک میں بنے چھوٹے سے دراز میں رکھے' اور وہاں سے بقایا ریزگاری نکال کر سامنے کھڑی ہنگرین لڑکی کے ہاتھ میں تھمادی اور نہایت خوش دلی سے بولی۔

"آپ کی آمد کا بہت بہت شکریہ' امید ہے آپ آئندہ بھی ہماری سروسز پر اعتماد کریں گی۔"

ہنگرین لڑکی نے ریزگاری گن کر پرس میں ڈالی سر کے اثبات سے اس کا شکریہ ادا کیا اور گلاس ڈور کھول کر باہر چلی گئی۔

"اس کوے جیسی ناک والی کو تم دوبارہ آنے کا کہہ رہی تھیں؟" ہاتھ میں ٹرے پکڑے کچن کی جانب جاتی ہوئی جوزی نے مصنوعی حیرانی سے اس کو دیکھا۔ جواب میں اس نے نہایت تندی سے جوزی کو گھورا۔ اپنی چھوٹی سی ناک سکیڑتے ہوئے وہ کرسی پر بیٹھی اور بے چینی سے گھڑی کی جانب دیکھا۔

پانچ بجنے میں ابھی بیس منٹ تھے۔

"اوہ!" کرسٹین کے منہ سے بے اختیار نکلا "آخر آج پانچ اتنی دیر سے کیوں بج رہے ہیں؟" پانچ بجے اس کی شفٹ ختم ہونا تھی' اور پھر اس منحوس شخص نے آنا تھا جس کا وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے انتظار کر رہی تھی۔ اس کو ذرا بھی خیال نہیں کہ مجھے کلاس لینا ہوتی ہے اور اگر وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی ٹریفک میں پھنس گیا تو' تو پھر مجھے مجبوراً "مزید آدھا گھنٹہ یا پھر پورا گھنٹہ اس منحوس ڈیسک پر بیٹھنا پڑے گا۔ حالانکہ اس کو معلوم تھا کہ آج کیون نے نہیں آنا' اور مجھے بیک وقت ڈیسک کلرک اور ڈیوٹی منیجر بننا پڑے گا' اوہ گاڈ پلیز آج عماد کو ٹریفک میں نہ پھنسا دینا' یا پھر صفوان کو ہی بھیج دینا اوہ گاڈ پلیز!" وہ دل ہی دل میں دعا کرنے لگی۔

"کیا مصیبت ہے؟" وہ بری طرح جھنجلا گئی۔ "آج میری اتنی امپورٹنٹ کلاس ہے اور عماد کو آج ہی لیٹ ہونا تھا' عمر کو اسی ہفتے ہی اسکول ٹرپ پر ایڈنبرا جانا تھا اور اس شخص کو یہیں بیٹھ کر مجھے گھورنا تھا؟"

اب اسے سامنے ریسٹورنٹ میں بیٹھے اس ہینڈسم سے لڑکے پر غصہ آنا شروع ہو گیا جس کو وہ مسلسل پانچ دن سے دیکھ رہی تھی۔ وہ شکل سے ایشین لگتا تھا' اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی جو کرسٹین کو پریشان کر رہی تھی۔ دو دن پہلے جب عمر یہاں تھا تو اس نے عمر کو بتایا تھا کہ "روز ایک آدمی ریسٹورنٹ میں آتا ہے' چائے پیتا ہے' مجھے گھورتا رہتا ہے' اور پھر چلا جاتا ہے۔" مگر عمر نے اس کی بات کا کوئی نوٹس نہ لیا تھا۔

اس نے گھڑی میں ٹائم دیکھا۔ پانچ بجنے میں پانچ منٹ تھے۔ ابھی تک عماد نہیں آیا تھا۔

"لعنت ہے لیڈز کی ٹریفک پر" وہ غصے سے بڑبڑائی اسے سوچ بورڈ پر بیٹھنا ذرا اچھا نہیں لگتا تھا۔

ایک دم ہی وہ کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنا بیگ اس نے ڈیسک سے اٹھایا اور کندھے پر لٹکایا۔ بھاڑ میں جائے ہوٹل اور بھاڑ میں جائے عماد۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتی داخلی دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔

کونے والی میز پر بیٹھا وہ لڑکا اٹھا اور پراعتماد قدموں سے چلتا ہوا فرنٹ ڈیسک کے پیچھے موجود کرسی پر آن بیٹھا۔

تقریباً" پانچ منٹ بعد اسے ہوٹل سے باہر پارکنگ لاٹ میں تیزی سے داخل ہوتی ایک ریڈ پورشے نظر آئی۔ عماد بالآخر آ چکا تھا (البتہ یہ گاڑی شاید اس کے ابو کی تھی)

گلاس ڈور کھول کر وہ اندر داخل ہوا تو فرنٹ ڈیسک پر ایک نئے چہرے کو دیکھ کر بری طرح چونکا۔

"کون ہو تم؟" اٹھارہ سالہ عماد ابرو چڑھا کر پوچھنے لگا۔

"آپ عماد ہیں؟" اس نے الٹا سوال کر دیا۔

"یس لیکن تم؟"

"مجھے مس کرسٹین نے اپنی جگہ کچھ دیر کے لیے بیٹھنے کو کہا تھا اس کو ضروری جانا تھا۔ اسی لیے وہ مجھے یہاں بٹھا کر چلی گئی کہ جب تک آپ نہ آئیں' میں ادھر بیٹھا رہوں۔" وہ سیٹ سے اٹھتے ہوئے شائستگی سے بولا۔

"اوہ ہاں..... وہ میں ٹریفک میں پھنس گیا تھا۔" عماد کچھ کھسیانا سا ہو کر بولا اور اور جگہ سنبھال لی۔ وہ جنرل منیجر تھا' مگر چونکہ ڈیسک کلرک کیون نے آج نہیں آنا تھا اسی لیے اسے یہ نشست بھی سنبھالنا تھی۔

اتنے میں فون کی گھنٹی بجی اس سے پہلے کہ عماد اپنا ہاتھ بڑھاتا' سامنے کھڑے بائیس تیئیس برس کے لڑکے نے نہایت پھرتی سے فون اٹھا لیا۔ "گڈ آفٹر نون۔"

دوسری طرف سے استفسار پر اس نے ڈبل بیڈ روم کا کرایہ بتایا اور پھر بکنگ لے لی۔ اتنے پیشہ ورانہ انداز پر عماد ہکا بکا رہ گیا۔

فون بند کرنے کے بعد اس نے "جنرل منیجر" کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔

"تم کس ہوٹل میں کام کرتے ہو؟" عماد نے اجنبی لڑکے کو قدرے دلچسپی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"فی الحال تو فارغ ہوں۔"

"پاکستانی ہو یا عرب؟"

"پاکستانی۔"

"نام کیا ہے تمہارا؟"

"خرم..... خرم زید۔" وہ مسکرایا۔

"اوہ ویل مسٹر زید! تمہیں ہوٹل میں کام کرنے کا تجربہ ہے؟"

"میں ٹین ایج سے یہی کر رہا ہوں۔ اس علاوہ میں نے پاکستان سے ہوٹل مینجمنٹ میں ماسٹرز کیا ہے۔" خرم کو معلوم تھا کہ اس کی ڈگری انگلینڈ میں تسلیم نہیں کی جاتی۔

"تم کرسٹین کے بوائے فرینڈ ہو؟"

"نو ایم جسٹ اے فرینڈ"

"تم اگر شام تک' بلکہ نو بجے تک' ریسپشن پر کام کر سکو تو۔" عماد اپنی جان چھڑا رہا تھا۔

"نو پرابلم!" وہ مسکرایا۔

"اوہ تھینکس۔" عماد اس کا مشکور ہوا "کام تو تم سمجھتے ہو نا؟"

خرم نے اثبات میں سر ہلایا عماد نے اس کی ID چیک کر کے اپنی تسلی کر لی۔

"میں اندر آفس میں ہوں رائٹ؟" عماد اٹھتے ہوئے بولا اسے محض چار گھنٹے کے لیے ایک نیا لڑکا ہرگز نہ رکھنا پڑتا' کیون چھٹی نہ کرتا تو۔

جب عماد چلا گیا تو خرم نے فون اٹھایا اور ایک نمبر ڈائل کیا۔ سلسلہ ملنے پر وہ بولا۔

"میں خرم بات کر رہا ہوں آئی ایم رئیلی گریٹ فل ٹو یو' کیون میری وجہ سے تمہیں چھٹی کرنا پڑی اور اپنے باس سے جھوٹ بولنا پڑا' ہاں مجھے ڈیل یاد ہے۔ مجھے ادھر کام کرنے کے تیس پاؤنڈز ملیں گے۔ آدھے یعنی پندرہ تمہارے ہوں گے تھینکس اینی ویز۔"

الوداعی کلمات کہہ کر خرم نے فون رکھ دیا۔ کیون اس کا روم میٹ تھا۔



میرا نام خرم زید ہے۔

ہوٹلز کی ایک چین بنانا میرے خوابوں میں سے ایک تھا۔ بلکہ شاید میرا سب سے بڑا خواب تھا۔

میں نے آنکھ کھولی تو اپنے اردگرد کے لوگوں کو چھوٹی چھوٹی خواہشات کے حصول کے لیے ترستا دیکھا میں گھر میں اپنے والدین کے بعد سب سے بڑا تھا۔ بڑا بچہ ہونے کے باعث مجھے بچپن سے ہی ذمہ داریاں اٹھانا آ گئی تھیں۔ گھر کا چھوٹے سے چھوٹا کام میں کرتا تھا' چاہے وہ چاچا نذیر کی دکان سے سودا سلف لانا ہو یا صحن میں جھاڑو دینا ہو' میرا کام ہر کسی کو خوش رکھنا تھا" خرم" کا مطلب خوش آدمی کے ہیں' میں خود تو اتنا خوش نہ تھا مگر دوسروں کو کوئی شکایت کا موقع نہ دیتا تھا۔

میرے ابا ایک چودہ گریڈ کے سرکاری ملازم تھے۔ انہوں نے ساری زندگی محنت اور ایمان داری سے کام کیا'

مگر ترقی نہ کی، مجھے ان سے نظریاتی اختلاف تھا۔ وہ کہتے تھے کہ وہ محنت کرتے ہیں۔ میرے نزدیک ایسی محنت کھڈے میں ڈالنے کے برابر ہے۔ اگر ساری عمر بندہ ایک دیوار کو دھکیلتا رہے اور وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہلے تو پھر ایسی محنت کا کیا فائدہ؟

میری سوچ ابا کے خیالات کے برعکس تھی۔ یہ بات میں نے کبھی ان کے منہ پر تو نہیں کہی تھی، کیونکہ مجھے جوتیاں کھا کر گھر سے نکلنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ البتہ دل ہی دل میں میں ابا کی باتوں کی مخالفت ضرور کرتا تھا۔

ابا سے مجھے کئی شکایتیں تھیں۔ انہوں نے کبھی ہماری حوصلہ افزائی نہیں کی تھی، کبھی شاباش نہیں دی تھی۔ میں اپنی کلاس میں اچھے نمبروں سے پاس ہوتا، صرف ابا کے ایک تحسین آمیز فقرے کے لیے جو مجھے کبھی نہیں ملا۔

میں اس وقت نو برس کا تھا۔ ہمارے چھوٹے سے گھر میں، بلکہ پورے محلے میں ٹی وی نہیں تھا۔ ابا کا ایک ریڈیو تھا جو وہ روز رات کو سنتے تھے۔

ریڈیو پر بی بی سی آتا تھا۔ انگریزی میری ہمیشہ سے اچھی تھی۔ میں اپنی کلاس کے بچوں کی نسبت جلدی پک کر لیتا تھا۔ اسی لیے میں نے بی بی سی سننے کی ٹھانی۔

رات کو ابا کے سونے کے بعد میں ریڈیو اٹھا کر اپنے کمرے میں لے آتا۔ یہ کمرہ پہلے کاٹھ کباڑ کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ جسے میرے لیے صاف کروا دیا گیا تھا۔

میں نے باقاعدگی سے بی بی سی اور سی این این سننا شروع کر دیا بولنے والے کے لب و لہجہ نقل کرتا رہتا تھا یہ سلسلہ چلتا رہا اور دس سال کی عمر میں میں امریکن اور برٹش ایکسنٹ میں انگریزی بہت روانی سے بول سکتا تھا اس خوبی کی وجہ سے میں جلد ہی دوسرے بچوں میں ممتاز نظر آنے لگا۔

شروع شروع میں تو سب صحیح تھا۔ پھر آہستہ آہستہ میری آنکھوں سے نیند غائب ہونا شروع ہو گئی۔ اور کچھ عرصے بعد میری نیند بالکل ہی ختم ہو گئی۔ میں تمام رات چارپائی پر لیٹا گزر کرتے پنکھے کو گھورتا رہتا۔ میں جتنا بھی تھکا ہوا ہوتا، مجھے نیند نہ آتی۔

پھر میری زندگی میں ایک تبدیلی آئی۔ زندگی میں پہلی بار میں نے خواب دیکھنا شروع کیے، جاگتی آنکھوں کا یہ خواب میری زندگی کا مقصد بن گیا۔

میں اس وقت ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا ایک روز میں اسکول سے گھر آیا تو ہر طرف خاموشی چھائی تھی۔ میں نے بستہ اپنے کمرے میں رکھا اور بے چینی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھا۔ پورا گھر سنسان پڑا تھا۔ سب کہاں چلے گئے؟ میں نے سوچا۔

کچن سے برتن کھڑکنے کی آواز آئی تو میں فوراً وہاں گیا۔ اندر جویریہ کھانا گرم کر رہی تھی۔

"بھائی! آ گئے؟" وہ پلٹی۔

"ہاں تم اندر تھیں، میں سمجھا گھر میں کوئی بھی نہیں ہے۔" میں اس کے قریب موڑھے پر بیٹھ گیا۔

"وہ اماں کی طبیعت خراب تھی۔ ابا انہیں لے کر اسپتال گئے ہیں، سونیا بھی ساتھ گئی ہے۔" اس نے پلیٹ میرے آگے رکھی۔

"اور مومنہ اور ماریہ کہاں ہیں؟" میں نے روٹی کا لقمہ توڑا۔

"وہ ساتھ والی خالہ فہمیدہ کے گھر ہیں میں بھی وہیں تھی، ابھی آپ کے آنے سے کچھ دیر پہلے آئی ہوں۔ کھانا کھا کر آپ بھی وہیں آ جائیے گا۔" اس نے میرے سامنے پانی کا گلاس رکھا۔

شام کو ہم خالہ فہمیدہ کے گھر تھے جب ابا سونیا کو لے کر آ گئے۔ جب وہ واپس جانے لگے تو میں نے ان سے زندگی میں پہلی بار کوئی فرمائش کی۔

"ابا! مجھے بھی ہسپتال چلنا ہے۔" وہ چند ثانیے میری طرف دیکھتے رہے، پھر انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ہسپتال پہنچ کر ابا اور میں ویٹنگ روم میں بیٹھ گئے۔ چند منٹ بعد ایک آدمی ابا کو بلا کر لے گیا۔

"سامنے فارمیسی سے یہ دوائیاں لے آؤ۔" ابا نے مجھ سے کہا وہ چھوٹا سا کلینک نما ہسپتال تھا۔ وہاں کوئی میڈیکل اسٹور نہ تھا۔ اسی لیے میں سڑک پار کے ایک میڈیکل اسٹور کی طرف چل پڑا دوائیاں اور بقایا رقم لے کر میں اسٹور سے نکلا اور ایک منظر نے میرا سانس روک لیا۔

میرا گھر تین کمروں (بشمول میرا اسٹور نما کمرہ) اور ایک چھوٹے سے صحن پر مشتمل تھا۔

کافی فاصلے پر کھڑی عمارت، شیشوں سے مکمل طور پر ڈھکی ہوئی تھی۔ ان شیشوں میں ارد گرد درختوں اور باقی عمارتوں اور آسمان کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔ میں بہت حیران ہوا۔ اتنے بڑے گھر میں کون رہتا ہے؟

پُر اعتماد تو میں بچپن سے ہی تھا۔ فوراً "مڑ کر گیسٹ سے

پوچھ لیا۔

"انکل یہ اتنا اونچا گھر کس کا ہے؟"

"یہ گھر نہیں ہوٹل ہے۔" ہنس کر کہا گیا۔

"ہوٹل؟ جہاں کرایہ دے کر لوگ کمرے حاصل کرتے ہیں شاید۔" میں نے سوچا۔ میرے ذہن میں پتہ نہیں کیا آیا، میں کلینک واپس جانے کے بجائے اس ہوٹل کی جانب چل پڑا۔ میں نے ایک عام سی جینز کے اوپر سفید رنگ کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ میں شکل سے ہی بہت کمزور اور دبلا پتلا لگتا تھا۔ اتنا تو مجھے آئیڈیا تھا ہی کہ مجھے ہوٹل میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ لیکن پھر بھی میں جی کڑا کر چل دیا۔ وہاں ایک باوردی، مونچھوں والا چوکیدار ٹائپ کوئی شخص بیٹھا تھا میں سیدھا اس کے قریب گیا اور رواں امریکن انگلش میں اسے مخاطب کیا۔

"آپ نے میری ممی کو اندر سے باہر آتے دیکھا ہے؟" وہ ایک دم گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور میں پر اعتماد قدموں سے چلتا ہوا اندر کی طرف بڑھ گیا۔

ہوٹل کی لابی اینمل سی گرین اور وائٹ کلر میں ڈیزائن کی گئی تھی ڈینش فرنیچر بہت نفاست سے بچھایا گیا تھا۔ ریسپشن شیشے کا بنا ہوا تھا جس کے پیچھے وائٹ شرٹ میں ملبوس ایک اسمارٹ سی ریسپشنسٹ کھڑی تھی۔ دائیں کونے میں چار عدد لفٹیں لگی تھیں۔

ایک گلاس ڈور ریسٹورنٹ کی جانب کھلتا تھا۔ میں دوائیوں والا لفافہ ہاتھ میں تھامے دروازے کو پش کر کے ریسٹورنٹ کے اندر داخل ہوا۔

یہ تو کوئی الگ ہی دنیا تھی الف لیلیٰ کی کسی کہانی جیسا ایک محل تھا جہاں کے کرداروں کے چہرے، لباس، چال ڈھال، سب ہی مختلف تھا۔ بہت نیا اور انوکھا میں نے اپنی پوری زندگی میں ایسے چہرے اور ایسی جگہ نہیں دیکھی تھی۔ یہ وہ لوگ نہ تھے جو گلیوں، بازاروں اور سڑکوں پر دکھتے تھے یہ اور لوگ تھے۔

میں کافی دیر تک اس ماورائی دنیا کی مخلوق کو دیکھتا رہا جس وقت میں ہوٹل سے باہر نکلا تو میرے ذہن میں ایک ہی عزم تھا۔

"کبھی میں بھی ایسا ہوٹل بناؤں گا ایک نہیں کئی ہوٹل۔"

اس روز میں نے جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھا تھا پہلا خواب۔



اس رات میری ایک بہن پیدا ہوئی اس کا نام میں نے رکھا تھا۔ تجل، وہ بہت پیاری بچی تھی۔ اس کے آنے کے بعد ہم چھ بہن بھائی ہو گئے تھے۔ بلکہ بھائی تو صرف میں تھا۔ البتہ بہنیں اب پانچ ہو گئی تھیں اور مجھے معلوم تھا کہ وہ سب اب میری ہی ذمہ داری ہیں۔

میرے دن اب بھی ویسے ہی تھے، پُر مشقت اور راتیں بے خواب، بے چین۔ میں اندھیرے میں ساری رات گزارتا، بغیر سوئے آہستہ آہستہ مجھے اندھیرے سے خوف آنے لگا میں اب لائٹ جلا کر رات گزارتا تھا۔ اکثر گھر کی کنڈیاں لگا کر جب اماں میرے کمرے میں آتیں تو بتی بجھا دیتیں ان کے آنے کی آہٹ سنتے ہی میں آنکھیں موند لیتا وہ چلی جاتیں تو میں دوبارہ بتی جلا لیتا۔

میری بے چین راتیں تب ختم ہوئیں، جب ابا کے کمرے میں دیوار والی الماری سے میرے ہاتھ ایک کتاب لگی "قصہ چہار درویش" کو میں نے پڑھنا شروع کر دیا، ان طویل راتوں میں جب مجھے نیند نہیں آتی تھی۔

یہ بھی ایک الگ دنیا تھی لفظوں کی دنیا، جہاں کے بسنے والوں کے چہرے نہیں صرف نام تھے۔ رونما ہونے والے واقعات حقیقی نہیں محض تصوراتی تھے۔ ہر پڑھنے والے کے تخیل میں ابھرنے والی تصویر مختلف ہوتی تھی۔ یہ سب کچھ افسانوی تھا، مگر ان لفظوں میں اتنی طاقت اور کشش تھی کہ کئی دن تک میں کچھ اور سوچ ہی نہ سکا۔

یہ وہ پہلی کتاب تھی جو میں نے پڑھی اور اس نے مجھے اپنی طرف ایسا کھینچا کہ ..... مجھے ایک لذت سی محسوس ہونے لگی تھی۔ میرے دل میں ایک پیاس تھی، دنیا کو جاننے کی، دریافت کرنے کی، یہ کتابیں میری پیاس بجھاتی تھیں۔ کتابوں سے میرا ایک خاص، تعلق بن گیا تھا۔ ایک لازوال رشتہ میرا کوئی دوست نہ تھا، میرے وجود میں ایک احساس تنہائی تھی، جسے کتابوں نے ختم کیا۔



سیکنڈ ایئر کے امتحانات ختم ہوئے تو یوں لگا جیسے کاندھوں سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا ہو، پیپرز کافی حد تک اچھے ہو گئے تھے اور مجھے نوے فیصد سے زیادہ مارکس آنے کی توقع بھی تھی۔ جس روز میرا آخری پریکٹیکل ہوا، اس شام میں تھکن اتارنے کے بہانے بستر پر لیٹا سونے کی کوشش

تارہا مگر نہ ہی تھکن محسوس ہو رہی تھی' نہ ہی نیند آئی۔"

رات قریباً" آٹھ نو بجے کے قریب میں نہا دھو کر کمرے سے نکلا تو چھوٹے سے گھر میں چھائی خاموشی گھر کے مکینوں کے سو جانے کی نشاندہی کر رہی تھی۔ میں دبے قدموں چلتا برآمدے میں پہنچا تو جویریہ چارپائی پر بیٹھی کھانا کھا رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھی۔

"اٹھ گئے بھائی؟ کھانا لاؤں۔"

"نہیں بھوک نہیں ہے۔ باقی سب نے کھا لیا؟" میں کھڑا کھڑا پوچھنے لگا۔

"جی کافی دیر ہو گئی کھا لیا۔" وہ رکی اور قدرے توقف سے بولی "بھائی! آپ کا آگے کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

اس کے سوال پر میرے ذہن میں اس فائیو اسٹار ہوٹل کا نقشہ گھوم گیا۔

"ایم بی اے۔" وہ سرہلا کر چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"جو! کیا بات ہے؟"

"بھائی ابا چاہتے ہیں' آپ سی ایس ایس کریں' جبکہ اماں کہتی ہیں کہ آپ ڈاکٹر بنیں۔" میں نے اس کی بات غور سے سنی اور بغیر تبصرہ کیے مڑ گیا' پھر ایک دم رکا اور ہمیشہ کی طرح بولا۔

"رات دیر سے آؤں گا دروازہ کھلا رکھنا۔" وہ جانتی تھی میں لائبریری جا رہا ہوں' میں گھر سے نکلا بھی اسی ارادے سے تھا' مگر آج کچھ بھی پڑھنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ جویریہ کی کہی ہوئی بات میرے کانوں میں گونج رہی تھی۔

"ابا چاہتے ہیں آپ سی ایس ایس کریں۔"

ابا کا بہت رعب تھا ان کا حکم کوئی نہیں ٹال سکتا تھا۔ اگرچہ میں ان کو بارہا بتا چکا تھا کہ میں ایم بی اے کرنا چاہتا ہوں۔ ابا نے کبھی میری حوصلہ افزائی نہیں کی تھی کبھی کسی کامیابی پر سراہا نہیں تھا۔ اس سب کے باوجود میں پوری دلجمعی سے پڑھتا رہا اور اب جب میری زندگی کے سب سے اہم فیصلہ کا وقت تھا تو ابا اس میں بھی اپنی مرضی چلانا چاہتے تھے۔

میں سڑک کے کنارے بیٹھ گیا اور ٹریفک کے اژدھام کو دیکھنے لگا۔ اگر میں سی ایس ایس میں کامیابی حاصل کر لوں بلکہ ٹاپ بھی کر لوں تو کیا ہو گا فارن افیئرز بیورو کریٹ یا پولیس۔ ان سب میں پر آسائش زندگی تھی مگر یہ میری خواہش نہ تھی۔



اگلے روز اتوار تھا۔

صبح سویرے بغیر ناشتہ کیے میں گھر سے باہر نکل گیا۔ ہم جیسے گھرانے اخبارات و رسائل جیسی عیاشیاں افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لیے میں گلی کے نکڑ پر بنی چاچا نذیر کی دکان کی طرف چلا گیا۔

"سلام چاچا!" میں نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"والسلام بیٹا کیسے ہو؟"

"ٹھیک ہوں چاچا آپ سنائیں؟"

"بس اللہ کا فضل ہے۔ زندگی کی گاڑی چل رہی ہے۔" وہ اخبار میرے سامنے رکھتے ہوئے بولے "ابا کو کہنا دو ماہ کا ادھار رہتا ہے۔ جلدی بھیج دیں' آج کل تو دھندا بہت مندا جا رہا ہے۔" وہ ہمیشہ کی طرح شروع ہو چکے تھے۔

میں نے نوکری کے لیے دیے گئے تمام اشتہارات دیکھ لیے مگر میرے کام کا کوئی بھی نہ تھا۔ درحقیقت میں کسی کام کا نہ تھا میری کوئی کوالیفکشن ہی نہ تھی۔ مجھے کہاں جاب ملے گی؟ میں نے قدرے مایوس سا ہو کر اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ مگر اچانک ہی ایک اشتہار پر میری نگاہ پڑی۔

"ضرورت ہے ایک مرد/عورت کی جو انگریزی زبان میں روانی رکھتا/رکھتی ہو تنخواہ معقول ہو گی امیدوار 31 مئی تک رابطہ کریں امریکن لب و لہجہ والے مرد و خواتین کو فوقیت دی جائے گی۔"

نیچے ایک کال سینٹر کا پتہ درج تھا۔ میں نے اسے ذہن نشین کر لیا اور اطمینان سے گھر کی جانب بڑھ گیا۔ جہاں ایک اور قیامت میری منتظر تھی۔

"تم ایم بی اے کرو گے؟" ابا کرخت لہجے میں بولے "کون سا کاروبار کرنے کا ارادہ ہے جناب کا؟" ان کے لہجے میں واضح طنز کی جھلک میں محسوس کیے بنا نہ رہ سکا۔

"ہوٹل مینجمنٹ۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہتے ہوئے سر جھکا لیا۔

"تمہارا باپ کوئی لینڈ لارڈ نہیں ہے خرم! اب میرے پاس تمہاری پڑھائی کے اخراجات پورے کرنے کے لیے مزید پیسہ نہیں ہے اور ایم بی اے کر کے تم کون سا تیر مار لو گے؟"

"خرچا میں اپنا خود اٹھاؤں گا لیکن پڑھوں گا ضرور۔" میں مضبوط لہجے میں بولا۔

"کیوں؟ تم نے کوئی نوکری ڈھونڈلی ہے؟!" وہ زہر خند لہجے میں بولے۔

"جی۔"

"ہوٹل مینجمنٹ کا شوق ہے نا تمہیں' بیرا گیری کرو گے یا کسی ریسٹورنٹ میں برتن مانجھو گے؟"

"جو بھی کام ملے گا کروں گا۔ آپ کو مجھ پر کوئی اضافی پیسہ نہیں خرچ کرنا پڑے گا۔" میں نے غصے کو قابو کرتے ہوئے کہا۔

"کتنے کی نوکری ملی ہے؟" ان کے لہجے میں طنز تھا۔

"چودہ ہزار کی۔" میں نے تڑخ کر کہا۔

"تم نوکری کرو گے یا پڑھو گے؟" وہ اب نرمی سے کہنے لگے۔

"دونوں کروں گا۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"اگر تمہیں اتنی اچھی نوکری مل ہی گئی ہے تو پھر آگے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ ویسے بھی دو تین برس تک میں ریٹائر ہو جاؤں گا۔ پھر سارا خرچہ تم نے ہی اٹھانا ہے۔" ان کا لہجہ بہت حد تک میٹھا ہو چکا تھا۔

"میں اپنی پڑھائی کے لیے جاب کر رہا ہوں ابا! گھر کے خرچوں کے لیے نہیں میں پیسہ اس لیے کمانا چاہتا ہوں تاکہ میں اپنا بزنس اسٹارٹ کر سکوں یہ گھر اور اس کے خرچے آپ کی ذمہ داری ہیں۔ میری نہیں۔" میں اتنا کہہ کر مڑا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

اپنے کمرے میں آ کر میں نے کنڈی چڑھائی اور بستر پر ڈھے سا گیا۔



میرے ساتھ ویٹنگ روم میں مزید تین لڑکے اور دو لڑکیاں تھیں۔ سب ہی مجھ سے عمر میں کافی بڑے تھے۔

بالآخر میری باری آ ہی گئی۔ دھڑکتے دل کے ساتھ میں دروازہ کھول کر اندر آفس میں داخل ہوا۔ فوراً" ہی میرے وجود سے اے سی کی یخ بستہ ہوا ٹکرائی' آفس میں لکڑی کا فرنیچر تھا۔ فل سائز کھڑکیوں کے آگے کریم اور گولڈ کلر کے مخملیں پردے گرے تھے۔ آرام دہ کرسی پر افضل راؤ براجمان تھے۔ وہ کمپنی کے منیجر تھے۔ انہوں نے ہی میرا انٹرویو کرنا تھا۔

"بیٹھیے۔" انہوں نے میری فائل پر سے نگاہیں اٹھائے بغیر کہا۔ میرا اعتماد کسی حد تک بحال ہوا' میں آرام سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"ایف ایس سی کی ہے؟" انہوں نے میری فائل ڈیسک پر رکھی' عینک اتار کر اس کے اوپر رکھ دی اور میری طرف پہلی بار دیکھا۔ ان کے چہرے کے تاثرات سنجیدگی سے ایک دم ہی ہمدردی میں تبدیل ہو گئے۔ وہ تھوڑے آگے کو جھکے اور پوچھنے لگے۔

"بیٹا کیا عمر ہے تمہاری؟"

"اٹھارہ سال اور پچیس دن۔" میں نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

"ہوں..... جاب کیوں ڈھونڈ رہے ہو؟"

"ڈھونڈ کہاں رہا ہوں' مجھے تو جاب مل گئی ہے۔" میں آہستہ سے مسکرایا۔

دو تین سیکنڈ تک وہ حیرانی سے مجھے دیکھتے رہے پھر بولے "کدھر؟"

"اسکائی ہائی ٹیلی کام میں۔" میں نے ان کی فرم کا نام لیا۔

چند ثانیے تک تو میری دماغی حالت پر شبہ کرتے ہوئے انہوں نے مجھے گھورا پھر کہنے لگے "اور کس نے تمہیں اسکائی ہائی میں جاب دی؟"

"آپ نے دینا ہے۔"

"تمہیں کیسے یقین ہے کہ میں تمہیں ہی جاب دوں گا؟" انہوں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"کیونکہ میں ہی سب سے زیادہ ڈیزرونگ ہوں۔" میں نے زور دے کر کہا۔ "باقی سب لوگ مجھ سے عمر میں بھی بڑے ہیں اور عقل میں بھی لیکن ان میں کام کرنے کا وہ جذبہ نہیں ہے۔ جو مجھ میں ہے میں پورا دن نان اسٹاپ کام کر سکتا ہوں۔"

"تم سمجھتے ہو تم بہت اسمارٹ ہو مسٹر زید؟"

"میں یہ سمجھتا نہیں ہوں۔ میں یہ جانتا ہوں۔" میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

"آؤٹ۔"

میں نے بے یقینی سے ان کو دیکھا "جی؟"

"میں کہہ رہا ہوں!" وہ غصے میں بولے۔

میں چند ثانیے تک حیرت اور تاسف سے ان کو دیکھتا رہا' پھر کھٹاک سے اٹھا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا آفس

سے باہر آیا۔

مجھے مایوسی سے جاتا دیکھ کر ایک خوشحال گھرانے کی اسمارٹ سی امیدوار کہہ اٹھی "لو بھئی! یہ بچہ تو گیا۔" پورا کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔

کال سینٹر سے مایوس ہو کر میں اپنی اوقات پر لوٹ آیا یعنی اچھے بچوں کی طرح کسی ہوٹل میں جاب ڈھونڈنا شروع کر دی۔ دو دن کی مسلسل تگ و دو کے بعد مجھے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ویٹر رکھ لیا گیا۔ تنخواہ محض تین ہزار تھی مگر کچھ نہ ہونے سے تو بہتر تھی۔

وہ عام سی صبح تھی جب زندگی میں پہلی دفعہ میرے نام ڈاک آئی۔ جب ڈاکیہ نے رجسٹری پر میرے دستخط مانگے تو میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

سفید لفافے کو اوپر سے پھاڑ کر میں نے وہ کاغذ نکالا جو میرے نام بھیجا گیا تھا وہ اپائنٹمنٹ لیٹر تھا۔ مجھے اسکائی ہائی ٹیلی کام کے کال سینٹر پر نوکری مل گئی تھی۔ مجھے اگلے دن جوائن کرنا تھا۔

میں نے بے یقینی سے اس لیٹر کو دیکھا بے اختیار مجھے افضل راؤ صاحب کی تیز لہجے میں کہی گئی بات یاد آئی 'اور تمہیں کیسے یقین ہے کہ میں تمہیں ہی جاب دوں گا؟'

"آؤٹ!"

اور انہوں نے مجھے نوکری دے دی

میں نے خط پر دوبارہ نگاہ دوڑائی تنخواہ چودہ ہزار تھی۔

ایک دم ہی میں نے ہنسنا شروع کر دیا اور پھر ہنستا ہی چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

شام پانچ بجے سے صبح پانچ بجے تک 'بلاناغہ' میں نے کال سینٹر جانا شروع کر دیا۔ کام اتنا زیادہ نہیں ہوتا تھا۔

کام زیادہ نہ تھا، مگر ہوٹل کینجمنٹ کی طرح 'گھنٹے' بہت لگانے پڑتے تھے۔ اکثر ایک ڈیڑھ گھنٹے کے توقف سے ہی فونز آتے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ دوسرے کام بھی ہمارے ذمے تھے۔

میرے دونوں ساتھیوں نے یکے بعد دیگرے جاب چھوڑ دی۔ کوئی بارہ گھنٹے، وہ بھی رات کو جاب کرنے پر تیار ہی نہ تھا۔ اسی وجہ سے تنخواہ بہت پرکشش تھی۔ میں نے صورت حال دیکھ کر اس سے فائدہ اٹھانے کی ٹھانی اور منیجر صاحب کے سامنے ایک تجویز رکھ دی۔

میں پہلے بھی کام بہت جلدی کر لیتا تھا، میری درخواست کے پیش نظر انہوں نے مزید دو کے بجائے ایک آپریٹر ہائر کیا اور دو کا کام مجھے سونپ دیا میری تنخواہ میں تیس فیصد اضافہ کر دیا گیا۔

جس روز ابا کے لہجے میں مجھے تبدیلی محسوس ہوئی تھی، اسی روز سے میں نے اپنی ایک عادت کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ دوسروں کو خوش رکھنے والی عادت۔

☆ ☆ ☆

میں نے بطور ویٹر ہوٹل میں اپنے کچھ اصول بنا رکھے تھے۔

ویٹر کی تنخواہ سے زیادہ پرکشش ٹپس ہوتی ہیں جو ہر گاہک کو دینا پڑتی ہیں انہی ٹپس کے متعلق میرے کچھ اصول تھے۔ میں ہمیشہ کاروباری افراد 'خصوصاً' وہ جن کی کوئی میٹنگ چل رہی ہو، ہیرے جواہرات سے لدی پھندی ہائی جینٹری کی نک چڑھی خواتین 'اور لڑکیوں کے پاس' بل لے کر جاتا تھا کیونکہ ان لوگوں سے ٹپ بہت ملتی تھی، مجھے کام کرتے ہوئے دو مہینے ہو گئے تھے جب میرا رزلٹ آؤٹ ہوا۔ اگر سچ پوچھیں تو مجھے یاد ہی نہیں تھا کہ آج رزلٹ ہے۔ وہ تو جب میں ہوٹل سے سوا پانچ کے قریب گھر پہنچا تو میری بہنیں مٹھائی کے ایک ڈبے کے گرد بیٹھی تھیں۔ مجھے دیکھ کر ان کے چہرے کھل اٹھے۔

"بھائی!" سونیا نے مجھے نہایت خوشی کے عالم میں بتایا "آپ کا رزلٹ آ گیا ہے۔"

"اچھا؟" میں نے حیران ہو کر اس کو دیکھا "تمہیں کیسے پتا؟"

"بھائی! آپ کے کلاس فیلو امجد بھائی آئے تھے، انہوں نے بتایا! انہیں آپ کا رول نمبر پتا تھا۔" ماریہ نے اخبار میری طرف بڑھایا۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ اس پر نگاہ دوڑائی۔ میں نے نوے فیصد مارکس حاصل کیے تھے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"بھائی! منہ میٹھا کریں۔" ماریہ نے ڈبہ کھول کر میری طرف بڑھایا۔

میں نے ایک رس گلہ اٹھا کر منہ میں رکھ لیا پھر ایک خیال کے تحت پوچھا "یہ کس نے منگوائی ہے؟"

"ہم نے آپ کے لیے منگوائی ہے۔" ماریہ نے فرضی

کالر جھاڑے۔

"واہ بھئی!" میں نے ہنستے ہوئے کہا اور سجل کو اٹھا لیا۔

بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز پر ہم سب نے پیچھے مڑ کر دیکھا ابا اندر داخل ہو رہے تھے۔

"سلام ابا!" میں نے مودب لہجے میں کہا۔

انہوں نے سلام کا جواب دیا پھر مٹھائی کے ڈبے کی بابت استفسار کیا۔ جویریہ نے خوشی خوشی ساری بات ان کے گوش گزار کر دی۔

"اچھے نمبر ہیں نا ابا؟" مومنہ نے چہکتے ہوئے کہا۔

"ہوں" انہوں نے زور سے کہہ کر اثبات میں سر ہلایا اور اندر چلے گئے۔

میرا دل یکدم بجھ سا گیا۔

ساری خوشی ایک دم ہی خاک میں مل گئی تھی۔ میں نے سجل کو جویریہ کے حوالے کیا اور اندر اپنے کمرے کی جانب قدم بڑھا دیے۔

میں بہت تھک گیا تھا۔ سوچا کچھ دیر آرام کر لوں سو تو سکتا نہیں تھا۔ لیکن جب میری نگاہ گھڑی کی جانب اٹھی تو میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ چھ بجنے میں پندرہ منٹ تھے۔ آفس کی گاڑی آنے ہی والی تھی۔ آرام کو پھر کبھی پر موقوف کر کے میں بوجھل دل کے ساتھ کپڑے بدلنے چلا گیا۔

☆ ☆ ☆

"اے فائیو... اے ٹو... سی تھری ای فور پلس ایک مینگو 'ایک اورنج۔" میں نے آرڈر نوٹ کر لیا۔

"اور ڈیزرٹ؟" میں نے مودب لہجے میں پوچھا۔

چوبیس پچیس سالہ نوجوان نے چند لمحے کو سوچا اور پھر شانے اچکا کر اپنے سامنے بیٹھی خوبصورت سی ٹین ایج لڑکی کی طرف دیکھا "تم آرڈر کرو۔"

اس نے کارڈ ایک لمحے کو غور سے دیکھا اور پھر چار ڈیزرٹس آرڈر کر دیے۔

"ان میں سے کوئی بھی لے آؤ۔" وہ لاپروائی سے بولی۔

میں نے کچھ کنفیوز سا ہو کر اس کی جانب دیکھا۔ "کوئی بھی؟"

"ہاں جو چاہے لے آؤ۔ بلکہ چاروں ہی لے آؤ مجھے کون سا بل دینا ہے۔"

میں بہت حیران ہوا تھا "آپ کو بل کیوں نہیں دینا' میم؟"

اس نے تندی سے مجھے گھورا "کیونکہ یہ میرے ڈیڈ کا ہوٹل ہے یو ایڈیٹ!" میں نے سر ہلا دیا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے اورنج جوس کا گلاس اس نوجوان کے سامنے رکھا۔ ٹرے میں سے دوسرا گلاس اٹھاتے ہوئے یونہی میری نگاہ اس لڑکے کے بائیں ہاتھ کی تیسری انگلی میں پہنی ہوئی بڑی سی انگوٹھی پر پڑ گئی۔ میری بہنوں کے پاس ایسا کچھ نہیں تھا کیونکہ ان کا باپ ایک تنخواہ دار سرکاری ملازم تھا اور بھائی بیراگیری کرتا تھا۔ ان کے پاس اچھے کپڑے اور جوتے نہیں تھے۔ حالانکہ اس لڑکی کی طرح وہ بھی اچھی صورت رکھتی تھیں۔ ان کے بھی خواب تھے جیسے.....

"یو ایڈیٹ!" وہ چیخی تو میں حقیقت کی دنیا میں واپس آیا۔ اپنی سوچوں میں میں اتنا مگن تھا کہ بے دھیانی میں مینگو جوس کا گلاس رکھتے وقت تھوڑا سا جوس چھلک کر اس کے کپڑوں پر گر پڑا۔

"سوری میم!" میں نے گھبرا کر ٹشو اس کو پکڑایا۔ بمشکل سات آٹھ قطرے ہی گرے تھے۔

اس نے غصے سے ٹشو میرے منہ پر مار دیا۔ "بلاؤ اپنے منیجر کو"

میں فوراً حکم سن کر پیچھے مڑا مگر کوئی پہلے ہی ان کو بلا لایا۔

"یہ تہذیب ہے تمہارے ویٹرز میں۔"

وہ غصے سے دھاڑنے لگی۔

منیجر صاحب نے گھبرا کر میری جانب دیکھا۔ "میم' اس کی طرف سے میں آپ سے معافی مانگ لیتا ہوں۔ اس سے غلطی ہو گئی ہے۔"

"غلطی؟ اس کی آنکھیں نہیں ہیں کیا؟" وہ چلائی۔

"میم...." منیجر کچھ کہنے لگے مگر اس نے ان کی بات کاٹ دی "میں ابھی ڈیڈ سے کہہ کر تمہیں سسپنڈ کروا دوں گی۔"

"مگر میں نے کیا کیا ہے میم؟" منیجر صاحب نے حیرانی سے کہا۔

"اس ویٹر کی بات کر رہی ہوں۔" وہ میری طرف مڑی "ناؤ گیٹ آؤٹ آف دس پلیس"

"آپ کے پاس کپڑوں کی کمی ہے، جو ایک ڈریس خراب ہونے سے آپ کا وارڈروب ختم ہو جائے گا؟" مجھے معلوم

تھا کہ اب مجھے یہ نوکری چھوڑنی ہی ہے' تو ذرا حساب چکا کر ہی چھوڑوں" ویسے بھی اتنے فضول کپڑے اچھا ہی ہوا کہ خراب ہو گئے۔ مگر خیر! آپ جیسی چیپ ٹیسٹ والی کے پاس ایسے اور بھی کئی چیپ ڈریسز ہوں گے نا؟"
"شٹ اپ۔"
"او یو شٹ اپ" میں نے زور سے کہا۔
قریباً" دس منٹ بعد میں کافی بے عزت ہو کر ہوٹل سے باہر سڑک پر کھڑا تھا۔
دوپہر کا وقت تھا۔ سورج اپنے جوبن پر تھا۔ چلچلاتی دھوپ میں میں سڑک کے کنارے چلتا جا رہا تھا۔ کہیں کوئی سائبان نہ تھا۔ ہر طرف دھوپ ہی دھوپ تھی۔
میری روزی کا ایک بہت بڑا حصہ آج ختم ہو گیا تھا۔ ایک اچھے مستقبل کے لیے میں نے اپنا حال اتنا کٹھن گزارا تھا پچھلے ڈھائی ماہ سے میں نے ہر طرح کا آرام اپنے اوپر حرام کر رکھا تھا۔ صرف اس لیے کہ میں اپنے تعلیمی اخراجات اٹھا سکوں مگر آخر میں مجھے کیا ملا' گالیاں اور دھکے؟
پہلے دو ماہ تو نوکری اتنی اچھی چلی تھی کہ میں کسی حد تک مطمئن ہو چکا تھا۔ اب تو آخری مہینہ تھا۔ اس کے بعد کالج کلاسز اسٹارٹ ہونا تھیں۔ پھر میں نے بیرا گیری چھوڑ دینا تھی۔ آج 16 اگست تھی' بس پندرہ دن ہی تو رہ گئے تھے مہینہ ختم۔ میں ایک دم وہیں رک گیا۔ حیرت کا بہت ہی شدید جھٹکا لگا تھا۔
آدھا مہینہ گزر چکا تھا اور میں اس کی تنخواہ یعنی ڈیڑھ ہزار روپے لیے بغیر ہی آ گیا۔ میرا حساب کتاب تو ہوا ہی نہیں تھا اور میں اپنا جائز حق لیے بغیر ہی ہوٹل سے منہ اٹھا کر چلا آیا۔
میں الٹے قدموں ہوٹل کی طرف مڑ گیا۔ چند منٹوں بعد میں منیجر صاحب کے دفتر میں کھڑا اپنا مدعا بیان کر رہا تھا۔
"جو ملازمین اس قسم کی حرکتیں کرتے ہوں' ان کو نوکری سے نکال کر ان کی پے کینسل کر دی جاتی ہے۔ ناؤ گیٹ لاسٹ۔"
اتنا غیر منصفانہ جواب سن کر میرا خون کھول اٹھا۔ یہ سراسر ناانصافی تھی۔ یہ ڈیڑھ ہزار روپے میرے لیے کیا اہمیت رکھتے تھے' صرف میں ہی جانتا تھا۔ انہوں نے میرا حق مار کر بہت برا کیا تھا بہت برا۔
میں بدلہ لینا چاہتا تھا' مگر بدلہ لینے میں جلدی بے وقوف کرتے ہیں۔ میں بے وقوف ہرگز نہ تھا۔

ایک دن آئے گا جب میرے پاس سو ہوٹلز ہوں گے۔ پھر میں اپنا بدلہ لوں گا۔ اس ہوٹل کے مالک کی بیٹی سے۔
اس ہوٹل کے مالک کا نام شیخ جہانگیر تھا۔ ان کو میں نے اخبارات میں کئی دفعہ دیکھا تھا۔
اس لڑکی کا نام ماہ نور جہانگیر تھا۔ مجھے اس لڑکی سے انتقام لینا تھا ہر صورت۔

☼ ☼ ☼

"سر! میں اوور ٹائم کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے پیسوں کی سخت ضرورت ہے۔" میں نے ایک دفعہ پھر راؤ صاحب کے سامنے التجا کی۔ "میں شام چھ سے صبح چھ کے بجائے دوپہر تین سے صبح آٹھ بجے تک کام کرنے کو تیار ہوں۔"
"تم تو کہہ رہے تھے تمہاری کالج کلاسز شروع ہونے والی ہیں۔" انہوں نے عینک اتارتے ہوئے کہا۔
"سر! کالج نو سے دو تک ہو گا۔" میرا اطمینان قابل دید تھا۔
"تو تم سوؤ گے کس وقت؟" حیرانی سے پوچھا۔
"میں سوتا نہیں ہوں مجھے انسومینیا ہے۔" میں مسکرایا۔
"اوہ!" وہ کافی حیران ہوئے' پھر قدرے توقف سے بولے "دیکھو خرم! اتنا کام کرنے سے تمہاری صحت بھی متاثر ہو سکتی ہے' تمہاری پڑھائی کا بھی حرج ہو گا اور......"
میں کھل کر مسکرا دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ میری درخواست مان لی گئی ہے۔
اگلے دو سال تک میں نے اپنا بی اے بھی مکمل کیا اور ساتھ ساتھ وہ جاب بھی چلائی' جس کی بدولت میرے پاس اتنا پیسہ جمع ہو گیا تھا کہ اپنے خوابوں کے حصول کے لیے میں پہلا قدم اٹھا سکوں۔
زندگی سے میں نے ایک ہی بات سیکھی تھی کہ کسی بھی مشکل سے مت گھبراؤ۔ یہ کٹھن اور دشوار گزار موڑ جو سفر حیات میں آتے ہیں' دراصل ہمیں ہماری منزلوں تک پہنچانے والے زینے ہوتے ہیں۔
میں نے ایم بی اے میں داخلہ لے لیا البتہ جاب نہیں چھوڑی۔
میں اب وہ ٹین ایجر لڑکا نہیں تھا میں نے جم جوائن کیا ہوا تھا۔ باڈی بلڈنگ کے علاوہ اسپورٹس میں خصوصاً فٹ بال اور رگبی میں میں بہت اچھا تھا۔ میں پڑھائی میں ایوریج

تھا' البتہ ڈیبیٹر بہت اچھا تھا اگر یونیورسٹی لیول تک کوئی مباحثہ ہوتا تو خرم زید اس میں ضرور ہوتا تھا۔ البتہ زیادہ تر میں اس سے دور رہتا تھا کیونکہ مجھے جاب بھی کرنا ہوتی تھی۔
میں بچپن سے ہی ریزرو قسم کا انسان تھا۔ یونیورسٹی میں آ کر میں نے چند رسمی دوست بنائے تھے۔ میں کام سے کام رکھنے والا انسان تھا۔
وسیم بھی ان ہی رسمی دوستوں میں سے ایک تھا۔
جب ایم بی اے فائنل ایئر کے ایگزامز ختم ہوئے تو وسیم نے سب دوستوں کو مالم جبہ اسکائنگ پر لے کر جانے کی دعوت دی۔ اس کے والد بیورو کریٹ تھے۔
سخت سردیوں کے دن تھے جب ہم مالم جبہ پہنچے۔ راہداری میں سے گزرتے ہوئے میری نظر اس قیامت خیز حسن کی مالک لڑکی پر پڑی' جو پیچھے مڑ کر مجھے دیکھنے پر مجبور تھی۔
یہی وہ لڑکی تھی جس کی وجہ سے میری نوکری ختم ہوئی تھی۔ اسی امیر زادی نے مجھے ہوٹل سے دھکے دے کر نکلوایا تھا اور اپنی آدھی تنخواہ حاصل کرنے کے لیے میں بہت ذلیل ہوا تھا۔
یہی لڑکی ماہ نور جہانگیر۔
مجھے اس سے نفرت تھی۔ مجھے ایسے تمام لوگوں سے نفرت تھی جو اپنی دولت پر غرور کرتے ہیں (الگ بات ہے کہ مجھے میرے کئی دوستوں اور یونیورسٹی کی لڑکیوں نے مغرور اور اکڑو خان کا لقب دیا تھا حالانکہ میں بالکل بھی مغرور نہ تھا۔ یہ شاید میرے چہرے کے نقوش تھے جن کے باعث میری پوری شخصیت پر مغرورانہ تاثر پڑتا تھا۔
شام کو جب ہم دوست لان میں گپ شپ کر رہے تھے تو میں نے گلاس والز والے ریسٹورنٹ میں اسے بیٹھا دیکھا۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا کہیں وہ مجھے پہچان تو نہیں گئی۔
میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے پہچانے' کیونکہ اس صورت میں میرا "انتقام پلان" تھوڑا گڑبڑ ہو جائے گا۔ میں اپنے طریقے سے بدلہ لینا چاہتا تھا۔ آہستہ آہستہ اور ہوشیاری سے۔
میرے شبہات کی نفی اگلے روز ہی ہو گئی جب میں لان میں بیٹھا مطالعہ میں محو تھا۔ مجھے کسی کی آواز سنائی دی۔ میں نے سر اٹھایا ماہ نور اپنے لبوں پر مسکراہٹ سجائے مجھے

دیکھ رہی تھی' مجھے اس لڑکی کے تصور سے ہی کوفت ہوتی تھی کجا اس کو برداشت کرنا۔ وہ شاید میری ظاہری شخصیت سے متاثر ہو کر میرے قریب آئی تھی۔ پہلے تو میں اس کے فضول سوالوں کے جواب دیتا رہا' پھر اتنا کہہ کر کہ "میں اجنبیوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتا" میں وہاں سے اٹھ آیا۔ میں نے اپنا ٹور انجوائے کیا اور اسلام آباد واپس آ گیا۔
اسلام آباد واپس آنے کے ہفتے بعد کی بات ہے جب میں نے اسے پہلی دفعہ دیکھا۔

☼ ☼ ☼

چونکہ میرا رزلٹ نہیں آیا تھا اور میں کافی دیر تک فارغ نہیں بیٹھ سکتا تھا' اسی لیے میں نے ایک اسکول میں' جس کے پرنسپل ابا کے دوست تھے' بطور اسپورٹس ٹیچر جاب کر لی۔
اسکول کے بچوں سے میری کافی دوستی ہو گئی تھی۔
اکثر بچے' جو اسی ایریا میں رہتے تھے' شام کو ریس کورس پارک جاتے تھے۔ وہ وہاں فٹ بال کھیلتے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی آفر کی کہ میں بھی ان کی مہارت دیکھنے وہاں آؤں۔ سو اس شام ایسے ہی میں ریس کورس پارک چلا گیا۔ سارا وقت بچے خود ہی کھیلتے رہے جبکہ میں سنگی بینچ پر بیٹھا ان کو دیکھتا رہا۔
تب ہی میری نظر وہیل چیئر پر بیٹھی اس لڑکی پر پڑی۔
وہ بہت خوب صورت نہیں تھی' مگر ایک عجیب سا حسن مجھے اس چہرے پر دکھائی دے رہا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے اس کا چہرہ بہت پُرنور بہت روشن ہو۔ وہ اتنی سادہ' اتنی معصوم تھی کہ مجھے گمان گزرنے لگا شاید میں کسی افسانوی کردار کو سوچ دیکھ رہا ہوں۔
اس کی آنکھیں بہت گہری تھیں۔ جیسے وہ بہت سوچتی ہو' مگر کہتی نہ ہو' اس کی آنکھیں خوب صورت تھیں' کالی سیاہ چمکدار آنکھیں...... مگر اس چمک کے پیچھے ایک عجیب نامعلوم' سی پژمردگی اور ہلکی ہلکی سی نمی تھی' جس کی وجہ میری سمجھ سے باہر تھی۔ اس کی آنکھوں کی طرح اس کے ہونٹ بھی بہت خوب صورت تھے' وہ آنٹی نما خاتون اس کی امی لگ رہی تھیں۔ ان کے مسلسل بولنے پر وہیل چیئر پر بیٹھی لڑکی نہایت معصومانہ انداز میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد اثبات میں سر ہلا دیتی۔
وہ میرے قریب سے روش پر سے گزر کر آگے چلی

گئیں، میں کافی دور تک اپنی نگاہوں سے ان کا تعاقب کرتا رہا ایک نامعلوم سا احساس میرے وجود کو اپنے حصار میں لے رہا تھا۔

کوئی چالیس گز دور جا کر ان خاتون نے وہیل چیئر کا رخ واپس موڑا تو میری خوشی کی انتہا نہ تھی۔ اب مجھے وہ نظر آ رہی تھی۔ وہ اب بھی ناول میں گم تھی، اس کی امی کی زبان ابھی تک چل رہی تھی۔

نجانے کتنی ہی دیر میں اسے یوں دیکھتا رہا۔

میں نے اس کی امی نما خاتون کو جھک کر اسے کچھ کہتے دیکھا، اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کی امی نے وہیل چیئر وہیں روکی اور روش پر چلتی ہوئی، دور کھڑی ایک ماڈرن خاتون کی جانب بڑھ گئیں۔ میں نے اس لڑکی کو دیکھا وہ ابھی تک ناول میں سر دیے بیٹھی تھی۔ جیسے اسے اپنے اردگرد کے لوگوں سے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو۔

میں نے دوبارہ اس کی امی کو دیکھا وہ ان خاتون سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں، میں ٹہلتا ہوا ان کے قریب چلا گیا اور کان ان کی باتوں کی طرف لگا دیے۔

”مسز جہانگیر! آپ ہمارے ساتھ چلیں نا، میرے ڈیزائنر کے آؤٹ لٹ پر۔“

”وہ تو ٹھیک ہے مسز نصیر، مگر میری بیٹی۔“ مسز جہانگیر کا تذبذب رسمی سا تھا۔

”کوئی بات نہیں میڈ کو کہہ دیجئے گا۔ وہیں outlet سے فون کر دیجئے گا۔ ابھی تو آپ چلیں نا“ مسز نصیر، مسز جہانگیر کو اپنے ساتھ لے کر پارک سے باہر چلی گئیں۔

مجھے اس حرکت پر بہت غصہ آیا تھا یوں اپنی بیٹی کو پارک میں تنہا چھوڑ جانا کہاں کا انصاف تھا۔ اس کو تو اتنا بھی معلوم نہ تھا کہ اس کی امی اس کو چھوڑ کر چلی گئی ہیں۔ وہ تو ناول میں گم تھی۔

ناول میں مگن اس لڑکی کو نہایت خوش اخلاقی اور شائستگی سے کہنے کہ اس کی والدہ جا چکی ہیں اور اپنی وہیل چیئر روش سے ہٹا کر سائیڈ پر کر لے، میں اپنی جگہ سے اٹھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کی جانب بڑھا، کال سینٹر پر جاب کرنے کے بعد مجھے ہر طرح کے لوگوں سے ڈیل کرنے کا طریقہ آ گیا تھا۔ میرے اس کے اور اس کی والدہ کے معاملے میں مداخلت پر وہ زیادہ سے زیادہ برا بھلا ہی کہہ دے گی تو کہہ دے۔ میں بس آرام سے سر ہلا کر واپس آ جاؤں گا۔

اس کے عقب میں پہنچ کر میں نے دھیرے سے ”ایکسکیوزمی“ کہا۔

وہ ناول کو ہی پڑھتی رہی۔ اس نے شاید میری بات نہیں سنی تھی۔

میں نے گلا کھنکھار کر اس کو متوجہ کرنا چاہا جواب ندارد۔

اس سے پہلے کہ میں کسی مشکل میں پھنس جاؤں یا اس کی اماں حضور واپس آ جائیں، میں نے تھوڑا سا بہادر بننے کا فیصلہ کر لیا۔ کون سی قیامت آ جائے گی اگر میں خود ہی اس کی بیساکھی کو دھکیل کر ایک طرف کھڑا کروں خوامخواہ ہی روش کے عین وسط میں اس کی وہیل چیئر نہایت آکورڈ لگ رہی تھی۔

میں نے عقب سے وہیل چیئر تھام لی اور اسے تھوڑا آگے کو دھکیلا۔ یکبارگی میری ہارٹ بیٹ مس ہوئی تھی اگر اس نے گھبرا کر شور مچا دیا تو؟

مگر اس کو پتہ ہی نہیں چلا تھا۔ میں اس کی وہیل چیئر دھکیلتے ہوئے ایک طرف لانے کے بجائے روش پر چلنے لگا۔ اس لڑکی نے سر نہ اٹھایا۔ وہ کتاب میں ہی گم بیٹھی رہی۔ اپنے بعد کسی اور کو میں نے اتنے جنون اور عشق سے مطالعہ میں غرق ہوتے پہلے دفعہ دیکھا تھا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی تھی۔

میں کافی دیر تک اس کی وہیل چیئر کو چلاتا رہا۔ ہم پارک کی حدود سے باہر نکل آئے تھے۔ اندھیرا پھیل رہا تھا۔ میں ایک انجان سی سڑک پر اس کی وہیل چیئر کے ساتھ موجود تھا دونوں اطراف میں وسیع و عریض بنگلوز موجود تھے۔ یہ جگہ پارک سے قریب ہی تھی میں نے واپس مڑنے کا فیصلہ کیا، مگر کچھ ہی دور ایک گاڑی رکی تھی اس سے باہر نکلنے والی مسز نصیر اور مسز جہانگیر تھیں۔ شاید وہ مسز نصیر کا گھر تھا۔ وہ دونوں کھڑی باتوں میں مشغول تھیں۔

اس سے پہلے کہ مسز جہانگیر ادھر ہی آ جائیں، اور مجھ پر اغوا یا حدود کا پرچہ کٹا دیں، نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اس کی وہیل چیئر کو وہیں روک دیا اور خود آرام سے پیچھے ہٹ گیا۔ اس تمام عرصے میں اس لڑکی نے سر نہیں اٹھایا تھا۔

وہ خاتون ابھی تک اپنی سہیلی سے گپوں میں مگن تھیں۔ اچانک ہی جیسے اس لڑکی کو ہوش سا آیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا آنکھوں میں بلا کی حیرت تھی۔

اس نے شانے اچکا دیے۔ اس کے اس انداز میں اتنی معصومیت اور بے ساختہ پن تھا کہ بے اختیار میرے لبوں پر ایک مسکراہٹ کھیل گئی۔

وہ اپنی وہیل چیئر خود ہی گھسیٹتی آگے لے گئی۔

میں ساری رات اسے سوچتا رہا اس کی یاد مجھے کچھ اور کرنے ہی نہ دے رہی تھی۔ آج تو مجھ سے کوئی کتاب بھی نہ پڑھی جا رہی تھی۔ ایک بہت نیا سا جذبہ میرے دل میں نمو پا رہا تھا۔ وہ احساس میری رگوں میں دوڑتے لہو کی طرح گرم، اور تپتے صحرا میں نخلستان کی مانند ٹھنڈا تھا بیک وقت مجھے بے چینی اور راحت محسوس ہو رہی تھی۔

جنوری کی یخ بستہ شب کے تیسرے پہر، خرم زید پر یہ ادراک ہوا تھا کہ اسے اس لڑکی سے، جو بہت خوب صورت تو نہ تھی، جس کو اس نے زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا، جس کا نام تک اسے معلوم نہ تھا اس لڑکی نے اس کو محبت ہو گئی تھی۔

تمام دن میں دل ہی دل میں اس کے شام کو پارک آ جانے کی دعا کرتا رہا میں ایسا کیوں چاہتا تھا، مجھے نہیں معلوم، بس میری خواہش تھی کہ میں اسے دوبارہ دیکھوں۔

میں گھنٹہ بھر پارک میں نہایت بے چینی کے عالم میں اس کا انتظار کرتا رہا۔ وہ نہیں آئی، مگر میں نے امید کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور وہیں بیٹھا رہا۔ بالآخر وہ اپنی نوکرانی کے ہمراہ آتی دکھائی دی اس کی گود میں کتاب رکھی تھی۔

ایک درخت کے قریب پہنچ کر اس کی نوکرانی نے وہیل چیئر روک دی اور غالباً“ اس کی ہدایت پر اسے وہاں تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔ وہ لڑکی کافی دیر تک وہاں بیٹھی ادھر ادھر دیکھتی رہی جبکہ میں اس سوچ میں غلطاں رہا کہ اس کے پاس جا کر کیا کہوں؟ کس طرح اپنے احساسات اس تک پہنچاؤں؟

”ہیلو مس نامعلوم! میں نے کل آپ کو پارک میں دیکھا اور مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے۔“

اچانک ہی میرے ذہن میں ایک نئی سوچ نے جنم لیا۔ میں دوڑتے قدموں کے ساتھ پارک سے نکلا میری جیب میں کوئی بڑا گلدستہ خریدنے کی رقم تو نہ تھی، البتہ ایک پھول خریدا جا سکتا تھا۔ ایک سفید پھول خرید کر اسی رفتار سے بھاگتا ہوا میں پارک میں واپس پہنچا شکر ہے وہ وہیں تھی میں نے اشارے سے قریب کھیلتے دانیال کو بلایا اور تاکید کی۔

”جاؤ، یہ پھول اس لڑکی کو دے آؤ۔ اگر پوچھے کہ کس نے دیا ہے تو کہہ دینا انہوں نے بتانے سے منع کیا ہے۔“

اس نے فوراً“ میرے حکم کی تکمیل کی۔

ہاتھ میں سفید گلاب پکڑے وہ معصوم سی لڑکی مسکرا رہی تھی۔ یعنی اسے برا نہیں لگا تھا۔ ایک تسلی بخش احساس میرے پورے وجود پر پھیل گیا۔

اس روز کے بعد یہ معمول بن گیا تھا۔ وہ روز شام کو پارک آتی اور میں بچوں کے ہاتھ اسے پھول بھجوا دیتا۔ یہ معمول تین ہفتہ جاری رہ سکا۔ اچانک ابا کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔

ابا جنہوں نے ہمیشہ مجھے ڈانٹا مارا، کبھی میری حوصلہ افزائی نہ کی، پیار کرنا تو دور کی بات، کبھی پیار سے پکارا تک نہیں، میری پڑھائی کی مخالفت کی، اماں کو ہمیشہ جھڑکا، بہنوں پر بے جا روک ٹوک کی، ہاں وہی ابا جن سے اماں نے تمام عمر وفا کی، جن کی ہمیشہ بہنوں نے خدمت کی، کبھی کوئی تکلیف نہ ہونے دی، ہمیشہ ان کی مرضی پر چلیں، ان کا حکم نہ ٹالا، وہی ابا جن سے لاکھ اختلافات ہونے کے باوجود میں نے بہت محبت کی تھی

پھر کتنے ڈھیر سارے دن اماں کو تسلی اور بہنوں کو دلاسا دیتے ہوئے گزرے، میرے اوپر ایک بہت بڑی ذمہ داری آن پڑی تھی، مجھے اب گھر کو سنبھالنا تھا۔

پھر اچانک ایک دن اس انجان لڑکی کا فون آ گیا۔ اس نے پارک میں آنے والے بچوں کی مدد سے مجھے ٹریس کیا تھا۔

اس کا نام سمل تھا سمل جہانگیر۔



میرا ڈیوٹی کا ٹائم پورا ہو چکا تھا میں سیٹ سے اٹھا اور عماد کے روم تک چلا آیا۔

”میرا خیال ہے میں اپنی ڈیوٹی کر چکا ہوں۔“ میرے کہنے پر اس نے سر ہلا کر دراز سے دس دس پاؤنڈز کے تین نوٹ نکال کر مجھے تھمائے۔ میں شکریہ ادا کر کے جانے ہی لگا تھا کہ اس نے مجھے پیچھے سے پکارا۔

”کھرم؟“ وہ شاید خ نہیں بول سکتا تھا۔ میں نے گردن موڑ کر اس کو دیکھا وہ پہلے کچھ سوچتا رہا، پھر بولا ”تم بیکھم کے کچھ لگتے تو نہیں ہو؟“

”کون بیکھم؟“

”ڈیوڈ بیکھم۔“

"وہ فٹ بالر جو مانچسٹر یونائیٹڈ کے لیے کھیلتا ہے۔" اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"نہیں تو کیوں؟"

"تمہاری شکل اس سے بہت ملتی ہے۔"

"اوہ..... اچھا؟" مجھے حیرانی ہوئی۔

ہلکی سی دستک کے ساتھ دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر صاحب اندر داخل ہوئے۔ عماد ایک دم جھٹکے سے کھڑا ہوا اس نے انہیں سلام کر کے میرا تعارف کرایا۔

وہ بلال احمد تھے۔ عماد کے چچا اور صفوان کے والد' صفوان عماد کا کزن تھا۔

بلال احمد نے مجھے بیٹھنے کو کہا۔ وہ اگلے آدھے گھنٹے تک میرا انٹرویو کرتے رہے۔ جب وہ جانے لگے تو انہوں نے مجھے وینس برج ہوٹل آنے کو کہا۔ یہ بھی ان ہی کا ہوٹل تھا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے عماد کو خدا حافظ کہا تو وہ بولا۔ "بی کیئر فل خرم..... انکل کسی اجنبی شخص کو یوں نہیں بلاتے۔"

"کیا مطلب؟"

"ان کے پاس سوئچ بورڈ پر کوئی نہیں ہوتا جو لڑکی پہلے ہوتی تھی' وہ اپنی ماں کے پاس بریڈ فورڈ چلی گئی ہے۔ میرے خیال میں وہ تمہیں جاب دینا چاہتے ہیں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا اور وہاں سے نکل آیا۔

ویسٹ ووڈ اسٹریٹ میں ٹہلتے ہوئے مجھے وہ دن یاد آ گیا جب میں سمل کے بلانے پر اس کے گھر گیا تھا۔ اس روز 17 مارچ تھی۔ آج سے دو ماہ اور تین دن پہلے۔

☼ ☼ ☼

وہ میری طرح تھی۔ بالکل میرے جیسی' بچپن سے جوانی تک محروم رہی تھی۔ اس کا کوئی دوست نہ تھا اس سے کسی کو محبت نہ تھی سب نے میری طرح اس کو کوئی فالتو شے سمجھ کر ہمیشہ نظر انداز کیا تھا۔ وہ ہمیشہ سے ہی الگ تھلگ رہنے کی عادی ہو گئی تھی۔ اس کی زندگی میں تنہائی تھی جسے ختم کرنے کے لیے وہ کتابوں کا سہارا لیتی تھی۔

جس طرح مجھے اپنی غربت کا کمپلیکس تھا' اسی طرح اسے اپنی معمولی شکل و صورت سے بہت سبکی اٹھانا پڑتی تھی۔ میں سو نہیں سکتا تھا تو وہ چل نہیں سکتی تھی۔ بالکل میری طرح وہ بہت زیادہ تنہا تھی۔

جب وہ مجھے ملی تو مجھے لگا کہ جیسے مجھے اپنی زندگی کی سب سے بڑی خوشی ملی ہو۔ وہ خدا کی طرف سے میری زندگی کا سب سے بڑا اور خوب صورت تحفہ تھی۔

اس شام' جھیل کے کنارے اس نے مجھے اپنے خواب بتائے تھے۔ اس کی خواہشات بہت معصومانہ تھیں۔ وہ بھی میری طرح خوابوں پر یقین رکھتی تھی گو کہ اس کے باپ کے پاس موجود دولت اسے کسی خوب صورت جزیرے پر ایک کیا دس گھر لے کر دے سکتی تھی' مگر اس کی خواہش تھی کہ اسے یہ سب کچھ کوئی اور لے کر دے۔ کوئی ایسا شخص جو اس کو چاہتا ہو تب میں نے اس سے کہا تھا۔

"سمل! اگر میں تمہارے خواب پورے کر دوں تو کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟ ساری عمر میرے ساتھ رہو گی؟"

اس نے کچھ حیرت سے میری جانب دیکھا۔

"کیوں؟ ایسے کیوں دیکھ رہی ہو؟ کیا میں تمہارے قابل نہیں؟"

اس کے چہرے پر ایک دم ہی ایسی رونق آ گئی تھی کہ مجھے لگا میری آنکھیں چندھیا جائیں گی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ مجھے لگا ہر جگہ خوب صورتی بکھر گئی ہو۔ ہر پودے کی ٹہنی پر' ہر ٹہنی پر' ہر کونپل کے شگوفے پر' ہر پھول کی پتی پر' گھاس کی چومتی ہوئی شبنم پر' جھیل کے گہرے پانیوں اور بادلوں کی اوٹ سے جھانکتی قوس قزح کے سارے رنگوں پر ہر جگہ خوب صورتی تھی۔

جب شام کے ملگجے سائے ہر سو پھیل رہے تھے' پرندوں کی چہچہاہٹ میں فضا میں گونج رہی تھی' جھیل کے پانی میں ٹھہراؤ آ گیا تھا' اس لمحے اس نے کہا تھا۔

"مجھے تمہاری آنکھوں میں اپنے نام کے دیے نظر آتے ہیں خرم! میں اسی روشنی میں اپنے خواب ڈھونڈنا چاہتی ہوں' بس ان جگنوؤں کو کسی تاریک رستے پر آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دینا' انہیں کھونا مت' ورنہ خواب مٹی میں مل جاتے ہیں اور مجھے اپنے خوابوں سے بہت محبت ہے۔"

میں نے مسکرا کر اس کا ہاتھ دبایا "مجھ سے شادی کرو گی؟"

"سوچ کر بتاؤں گی۔" وہ مجھے چھیڑنے لگی۔

"ٹھیک ہے سوچ لو' خوب سوچ لو۔ تم بھی کیا یاد کرو گی کس سخی سے پالا پڑا ہے۔" وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

دو روز بعد کی بات ہے' اس نے مجھے فون کر کے اپنے گھر بلوایا۔ اس کے انداز سے ہی لگ رہا تھا کہ کچھ گڑبڑ

ہے۔ ویسے بھی گڑبڑ کرانے کو ماہ نور اس گھر میں موجود تھی۔ ماہ نور جہانگیر جس سے مجھے شدید نفرت تھی۔

اس کے گھر آ کر ہمیشہ بہت الجھن ہوتی تھی۔ مجھے اپنی انا بہت عزیز تھی۔ مجھے اس کی دولت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس لیے میں اس تمام عرصے میں محض دوبار ہی "جہانگیر پیلس" آیا تھا۔

اس روز تیسری دفعہ اس محل نما گھر میں داخل ہوتے ہوئے مجھے پہلی بار بہت الجھن محسوس ہو رہی تھی۔

"میں تم سے شادی پر تیار ہوں مگر میری ایک شرط ہے۔" سمل نے کہا تھا۔

"کیسی شرط؟" اس کے لہجے میں الجھتے ہوئے میں نے پوچھا۔

"میری شرط یہ ہے کہ میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر میں رہوں گی....."

اس نے بات کا آغاز کیا۔ یہ بھی کوئی کہنے کی بات تھی۔ اس نے میرے گھر میں ہی رہنا تھا۔ وہ تو ایسے کہہ رہی تھی جیسے ہم نے وائٹ ہاؤس میں بسیرا کرنا ہو۔

"میرا مطلب ہے میں ڈیڈی کی دولت میں سے ایک روپیہ بھی نہیں لوں گی نہ ہی کسی قسم کا جہیز لوں گی۔ میرے حصے کی دولت میرے ڈیڈ کے پاس ہی رہے گی اور میرے مرنے کے بعد وہ ایک ٹرسٹ کے نام ہو جائے گی۔ میں تمہارے ساتھ تمہاری غربت میں گزارا کرنے کو تیار ہوں' لیکن جس طرح ڈیڈ کی جائیداد پر میرا کوئی حق نہیں' اسی طرح تمہارا بھی کوئی حق نہیں ہو گا میں تمام عمر تمہارے چھوٹے سے گھر میں گزارا کرنے کو تیار ہوں خرم زید! اگر تمہیں میری شرط منظور ہے تو بتاؤ۔"

اس کی نگاہوں میں اپنی حیثیت کا اندازہ تو مجھے ہو ہی گیا تھا۔ میں ایک ایسا غریب لڑکا تھا جس کا کوئی مستقبل نہ تھا تب ہی اس نے تمام عمر' والے الفاظ استعمال کیے تھے اور اس کے نزدیک میں غریب تھا اور غریب ہی رہوں گا۔ اس نے مجھ سے میرے مسائل شیئر کرنے کی بات نہ کی تھی "تمہاری غربت" کہا تھا وہ ان مسائل میں رہنا چاہتی تھی جن کو میں چھوڑنا چاہتا تھا میں ہمیشہ ایسا نہیں رہوں گا' یہ بات مجھے اس وقت سے معلوم تھی جب میں محض بارہ برس کا تھا۔ یہ بات میں اسے کئی دفعہ بتا چکا تھا کہ مجھے اس کے والد کی کوئی مدد نہیں چاہیے۔ اس نے ایک دفعہ اپنے والد سے کہہ کر مجھے جاب دلانے کی بات کی تھی مگر میں نے اسی وقت انکار کر دیا تھا۔ مگر اس کے باوجود وہ ایسے کہہ رہی تھی جیسے میں کوئی لالچی یا خود غرض انسان ہوں جسے اس کے بجائے اس کی دولت سے دلچسپی ہو۔ اگر اس کو میری ان باتوں کا یقین نہیں آیا تو بھلا میری محبت کا کہاں آیا ہو گا؟ مجھے معلوم تھا اس کو بلکہ شیخ جہانگیر کو بھی میں fortune hunter ہی لگوں گا۔ میری حیثیت ان کے برابر نہ تھی۔ ان کو میری بات کا یقین اس وقت آئے گا جب میں ان کے برابر پہنچوں گا۔

میرے پاس اس وقت دو راستے تھے۔ ایک آسان راستہ جس پر چل کر میں آسانی سے سمل سے شادی کر کے لالچی کا طوق گلے میں پہن لوں اور ایک اور راستہ بھی تھا کہ میں اپنے ہاتھوں سے کما کر ان کے برابر پہنچوں اور پھر عزت سے اس کا ہاتھ مانگوں دوسرا راستہ طویل اور کٹھن تھا۔ مگر میں نے اس کا انتخاب کیا۔

میں نے کوئی دلیل نہ دی' کوئی صفائی پیش نہ کی' کیونکہ سچ کو دلیلوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جو لوگ حق پر ہوتے ہیں وہ صفائیاں پیش نہیں کرتے۔

میں نے اسے الوداع کہا اور واپس آ گیا اگر اس وقت میں اسے کچھ کہتا بھی تو وہ میری بات نہ مانتی۔

میں نے اس روز اپنے اکاؤنٹ میں موجود رقم چیک کی میری پڑھائی پر پہلے ہی بہت کچھ خرچ ہو گیا تھا میرے اکاؤنٹ میں پندرہ ہزار سے زیادہ نہ تھے لیکن مجھے اسی پندرہ ہزار سے ۱۰۰ ہوٹلز بنانے تھے۔

میں ترقی کرنا چاہتا تھا۔ میں نے بہت سوچا اور انگلینڈ جانے کا فیصلہ کر لیا۔

یارک شائر میں پاکستانی کمیونٹی بہت بڑی تعداد میں قیام پذیر ہے۔ اسی لیے میں وہاں آیا تھا۔ مجھے وہاں ایک کمرے میں چار لڑکوں کے ساتھ رہنا پڑا تھا۔

قریباً" ایک ہفتہ میں ادھر رہا۔ چار روز میں نے ایک پیٹرول پمپ میں نوکری بھی کی' بریڈ فورڈ میں ایک پاکستانی فیملی کا ویئر ہاؤس تھا میں نے ایسے ہی ان کے متعلق پتہ کرایا تو معلوم ہوا کہ ان کے لیڈز میں کچھ ہوٹلز ہیں۔ کچھ سوچ کر میں وہاں آ گیا گو کہ مجھے کہیں اور بھی کوئی جاب مل جاتی مگر میں نے اس پاکستانی فیملی کا ہی انتخاب کیا سب سے پہلے میں نے اولڈ وکریج (یہ ان ہی کا ایک ہوٹل تھا) کے کیون ملر سے دوستی گانٹھی' اس کے اپارٹمنٹ میں آدھا کرایہ دے کر رہنے لگا' حالانکہ وہاں اپارٹمنٹس کے کرایے

آسمان کو چھو رہے ہوتے ہیں اکثر دس دس لڑکے دو کمروں کے گھر میں گزارا کرتے ہیں مگر میری خوش نصیبی تھی کہ مجھے کیون مل گیا۔ پھر میں نے اس سے جھوٹ بلوایا۔ وہ شادی شدہ نہیں تھا۔ اس نے عماد کو یہ کہہ کر کہ میری فیانسی کی ممی آ رہی ہیں، چھٹی مانگ لی مجھے چار گھنٹے کے لیے ڈیسک کلرک بننے کی ضرورت نہ تھی۔ مجھے عماد اور اس کے والد وچچاؤں سے تعارف چاہیے تھا' جو مجھے بالآخر مل ہی گیا۔

مورسے میں واقع بلال احمد کے ہوٹل وینس برج پر میں اگلے روز ہی چلا گیا۔ قریباً" آدھے گھنٹے کے تکلیف دہ انتظار کے بعد مجھے ان تک رسائی حاصل ہوئی۔

بلال صاحب کا آفس خاصا وسیع و عریض اور ویل فرنشڈ تھا۔ فل سائز کھڑکیوں کے آگے سرمئی رنگ کے پردے نہایت نفاست سے برابر کیے گئے تھے۔ اس اٹالین طرز کے آفس کو دیکھ کر میرے ذہن کے پردے پر ایک دھندلی سی شبیہہ ابھری جس کو میں پہچان نہ سکا۔

"آؤ..... بیٹھو۔" انہوں نے کھڑے ہو کر میرے ساتھ مصافحہ کیا میں ان کے مقابل کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"چائے یا کافی ؟" چائے غالباً" انہوں نے میرے پاکستانی ہونے کی وجہ سے پوچھی تھی۔

"کافی بلیک۔" میرے کہنے پر انہوں نے ایک کریم کافی اور ایک بلیک کافی کا آرڈر دیا۔ اس کے بعد وہ پوری توجہ سے میری جانب متوجہ ہوئے "تو مسٹر زید تم کیا کرنا جانتے ہو؟"

"میں تو ٹین ڈاؤننگ اسٹریٹ بھی چلا سکتا ہوں۔ آپ مجھے یہ بتائیے کہ آپ کے پاس میرے لیے کیا آفر ہے ؟" میں نے نہایت خود اعتمادی سے کہا۔

"میں تمہیں وینس برج پر جاب دینا چاہتا ہوں۔ تم ہوٹل میں کیا کیا کر سکتے ہو۔" اب کی بار وہ زور دے کر بولے۔

"میں بیل بوائے ویٹر' ڈیسک کلرک' ریسپشنسٹ' چوکیدار' شیف' ڈیوٹی منیجر اور جنرل منیجر تک سب بن سکتا ہوں۔"

"میڈ نہیں بچی ہیں وہ بھی کہہ دیتے۔" ان کے کہنے پر میں نس پڑا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

"خرم! اس شہر میں ہزاروں نوکری کی تلاش میں ہیں ب کی خواہش ہے کہ ان کو اچھی نوکری ملے۔ ان میں سے کئی ہمارے ہوٹلز کا چکر بھی لگا چکے ہیں 'مگر جانتے ہو میں نے تمہیں یہاں کیوں بلایا ہے ؟"

وہ ایک لمحے کو رکے تھے۔ دروازہ ہلکی سی دستک کے ساتھ کھلا تھا۔ ملازم کافی کے دو کپ لے کر اندر داخل ہوا تھا۔ اس کے جانے کے بعد وہ دوبارہ گویا ہوئے۔

"اس دن جب میں تم سے پہلی دفعہ ملا تھا تو مجھے لگا تھا تم ذہین ہو۔ تمہاری آنکھوں میں ایک ایسی چمک ہے جو بہت کم لوگوں کی آنکھوں میں' میں نے دیکھی ہے۔ تم نے اس روز کہا تھا تمہیں کامیابی کے لیے شارٹ کٹ حاصل نہیں کرنا چاہتے۔ کامیابی کے لیے شارٹ کٹس ہوتے بھی نہیں ہیں۔ صرف ایک رستہ ہوتا ہے 'محنت' ذہانت' اور تھوڑی سی لک کا۔"

"تھوڑی سی لک ؟"

"ہاں باقی سب کچھ اپنے دماغ اور ہاتھوں سے حاصل کرنا سیکھو۔"

یہ نصیحت اگر کبھی ابا نے کی ہوتی تو میں کتنا خوش ہوتا۔

"تم مجھے اپنا ہمدرد سمجھ سکتے ہو۔"

"لیکن مجھے کسی کی ہمدردی نہیں چاہیے۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ کچھ دیر وہ خاموشی سے مجھے تکتے رہے' پھر بولے۔

"چلو تم مجھے اپنا خیر خواہ سمجھ لو۔" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اب مجھے صاف صاف بتاؤ کہ تمہارا گول کیا ہے۔ کل تم نے کہا تھا تم دنیا فتح کرنا چاہتے ہو کیسے ؟"

"میں چاہتا ہوں میں 100 ہوٹلز کی ایک چین بناؤں۔ میں اس بزنس کو تسخیر کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے یہ بات سمل سے بھی کہی تھی 'مگر شاید اس نے یقین نہ کیا تھا۔

"اس کے لیے بہت پیسہ چاہیے۔" ان کی بات سن کر میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ صرف ذہانت اور محنت چاہیے۔"

"ذہانت رکھتے ہو ینگ مین ؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ جواب میں میں نے بھی محض مسکرانے پر اکتفا کیا۔

"تمہاری بیوی کہاں ہے ؟"

"جی ؟" میں نے حیران سا ہو کر ان کی جانب دیکھا۔ انہوں نے جواب میں میری انگلی کی جانب اشارہ کیا۔ جس

میں نے پریڈ فورڈ سے ایک آرٹیفیشل سلور انگوٹھی
ید کر پہنی تھی۔
میں نے مسکرا کر ان کی جانب دیکھا۔ "یہ نقلی ہے۔"
ی سمجھ میں آیا تھا یا نہیں' انہوں نے بس سر ہلا دیا۔
وہ اپنی نشست سے اٹھے آہستہ —— قدموں
ے چلتے ہوئے کھڑکی کے سامنے کھڑے ہو گئے آگے بڑھ
انہوں نے فل سائز کھڑکیوں کے سامنے سے پردے
کائے۔ شام کی نیلگوں روشنی اندر آنے لگی۔ انہوں
ے میری جانب دیکھا اور مدھم آواز میں بولے۔
"ہوٹل مینجمنٹ دنیا کا سب سے لگژریس بزنس ہے۔
ں میں پیسہ ہے' مواقع ہیں' چارم ہے۔ آپ روز ایشیا
ے افریقہ اور امریکہ سے آسٹریلیا تک ہر خطے کے لوگ
ھتے ہیں' ان کے بارے میں جانتے ہیں' بڑے بڑے
سیمینارز' کانفرنسیں' پارٹیز' فنکشنز' اہم بزنس میٹنگز'
ب ہوٹلز میں ہوتا ہے۔"
"لیکن اس کام میں ایک ڈرا بیک بھی ہے۔ آپ کو ٹائم
ت لگانا پڑتا ہے۔ یہ کوئی نائن ٹو فائیو جاب نہیں ہے۔
ں سب کے باوجود بھی اس میں ایک اپنا مزا ہے' ایک
و کھی سی لذت ہے۔"
وہ پتا نہیں کیوں لیکچر دے رہے تھے۔ یہ باتیں میں
سوں سے جانتا تھا۔ کچھ بھی نیا نہیں تھا کچھ بے چین سا
و کر میں نے ان کی بات کاٹی "ٹائم کا مسئلہ میرے لیے
یں ہے میں چوبیس گھنٹے کام کرنے کو تیار ہوں۔"
"تم جوش میں آکر......"
"نہیں سر! مجھے سونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے
نسومینیا ہے۔ میں کام کر کے تھکتا نہیں ہوں۔ میں
واقعی چوبیس گھنٹے کام کرنے کو تیار ہوں۔"
وہ چند ثانیے بغور میرا چہرہ دیکھتے رہے' پھر بولے "میں
تمہیں ایک مہینے کے ٹرائل پر ڈیوٹی منیجر رکھتا ہوں اگر
تمہاری کارکردگی تسلی بخش رہی تو...." انہوں نے فقرہ
ادھورا چھوڑ دیا۔
میں نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ ایک ہفتے کی تنخواہ
قریباً" اٹھارہ ہزار پاکستانی روپے بنے گی۔ یعنی قریباً" بہتر
ہزار پاکستانی روپے میں ایک مہینے میں کما سکتا ہوں۔ یہ بہت
کم تھا۔ اپارٹمنٹ کے خرچے' بلز اور ٹیکسز میں بہت
کچھ نکل جائے گا' پھر پاکستان رقم بھی بھجوانی ہو گی۔ یہ
بہت کم تھا' مگر فی الحال میں نے اسی کو کافی سمجھتے ہوئے

اثبات میں سر ہلا دیا۔ لیکن ایک بات میری سمجھ سے باہر تھی۔ وہ مجھ پر مہربان کیوں ہو رہے تھے؟



کال سینٹر پر ایک لمبا عرصہ کام کرنے کے بعد ہر طرح کے لوگوں سے ڈیل کرنے کا طریقہ آگیا تھا۔ جو بات مجھے دوسرے ورکرز سے ممتاز کرتی تھی۔ وہ میرا وینس برج پر چوبیس گھنٹے بیٹھنا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ اس بزنس میں کام کم اور وقت زیادہ لگانا پڑتا ہے۔ اگر آپ کو ایسا ورکر مل جائے جو تمام دن ہوٹل چلا سکے تو اور آپ کو کیا چاہیے؟ میری وجہ سے عمر اور حیدر کو ہوٹل پر نہیں آنا پڑتا تھا۔ (جس پر وہ "خرم بھائی" کے تہہ دل سے مشکور تھے)

اس روز ایک عجیب سی بات ہوئی۔

ایک سوٹ Suite کی بکنگ کو کمپیوٹر پر منتقل کر کے میں باہر لاؤنج میں آگیا۔ کارڈلیس فون میرے ہاتھ میں ہی تھا' کیونکہ ہر دس منٹ بعد گھنٹی ضرور بجتی تھی۔ میں نے فون لاؤنج میں رکھا' کچن سے اپنے لیے کچھ فرنچ فرائیز نکالے اور لاؤنج میں واپس آگیا۔ فرنچ فرائز کے ساتھ ہی مجھے عماد یاد آگیا۔

عماد کا خیال ذہن میں آتے ہی میرے لبوں پر ایک مسکراہٹ بکھر گئی میں نے اتنا ہنس مکھ لڑکا آج تک نہیں دیکھا تھا۔ منہ تک جاتا میرا ہاتھ یکدم رک گیا۔ اسے کہتے ہیں شیطان کا نام لیا اور شیطان حاضر! بیرونی دروازے سے عماد اندر داخل ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک لڑکا بھی تھا۔ وہ لڑکا جو شکل و صورت سے پاکستانی یا انڈین لگتا تھا اور قد میں عماد سے کچھ لمبا تھا' اس کے ساتھ بحث میں الجھا ہوا تھا۔ وہ دونوں دھیمی سرگوشیوں میں کسی بات پر تکرار کرتے ہوئے آ رہے تھے۔ عماد بار بار نفی میں سر ہلا رہا تھا' عماد اتنا الجھا ہوا۔ دکھ رہا تھا کہ اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں اور سیدھا آکر صوفے پر بیٹھ گیا۔ پھر اس کی نگاہ مجھ پر پڑی' اس نے چہرے کے تاثرات پرسکون کرنے کی ناکام کوشش کی اور مجھے سلام کر کے رسمی کلمات ادا کیے۔

وہ لڑکا دور کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ عماد نے اس کا تعارف بھی نہیں کرایا۔ پھر اچانک وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرا لڑکا اس کے قریب آیا تو وہ سر جھٹک کر آگے بڑھنے لگا' اس لڑکے نے اس کا بازو پکڑا اور اردو میں بولا۔

"عماد! پلیز تو میرا دوست نہیں ہے کیا؟"

عماد نے جواب پنجابی میں دیا "تم فضول بات کر رہے ہو اسے سمجھاؤ۔"

"وہ نہیں مانتی...." اب کے وہ لڑکا بھی پنجابی بول رہا تھا۔

"تم پیار سے سمجھاؤ۔"

"وہ نہیں مانتی۔"

"اس کو پاس بٹھاؤ اور پوچھو کہ اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے؟" عماد جھنجلایا۔

"سب کر کے دیکھ چکا ہوں۔ وہ نہیں مانتی۔"

"کوئی اور طریقہ سوچو۔" عماد نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

"طریقہ تو میں نے بتایا ہے۔" وہ اب منت کر رہا تھا۔

"نہیں نہیں اگر بابا یا امی کو پتہ چل گیا تو بہت برا ہو گا۔ ویسے بھی میں ان باتوں پر یقین نہیں کرتا۔"

"تم یقین کرتے ہو! تم نے خود ساری بات شروع کی تھی' اور اب مکر رہے ہو۔"

"وہ فراڈ ہے۔" عماد زور دے کر میری موجودگی کا احساس کیے بغیر بولا۔

"کیسے؟ اس کو ریحام کی مما کا نام تک معلوم تھا۔"

عماد نے اپنا بازو چھڑایا اور دروازے کی جانب بڑھ گیا' مگر وہ لڑکا پھر اس کے اور دروازے کے درمیان حائل ہو گیا۔

"عماد' مجھے اس کا ایڈریس دے دو۔" دور ہونے کے باعث اس کی آواز اب قدرے کم سنائی دے رہی تھی۔

"میرے پاس اس کا پتہ نہیں ہے۔ تم ریحام سے لے لو۔" اتنا کہہ کر عماد نے اسے ہٹا کر بیرونی دروازہ کھولا اور باہر چلا گیا۔ وہ لڑکا بھی بھاگتا ہوا اس کے پیچھے چلا گیا۔

"واؤ!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "کیا مسٹری ہے۔ واپس جا کر میں سمل کو اس بارے میں ضرور بتاؤں گا۔" میں نے سوچا تھا۔



عماد سے میری ملاقات اگلے دو روز تک نہیں ہوئی میں اس کی اور اس لڑکے کی پراسرار سرگوشیوں کو بھلا چکا تھا جب اس دن صبح نو بجے کے قریب فون کی گھنٹی بجی' میں نے ایک ہاتھ بڑھا کر فون اٹھایا' جبکہ دوسرے ہاتھ سے روم نمبر 203 کا بل بنانے لگا۔

"ویلکم ٹو دی وینس برج ہوٹل کین آئی ہیلپ یو؟"

دوسری طرف سے ایک نسوانی آواز ابھری "کیا میں عماد سے بات کر سکتی ہوں؟"

"عماد اولڈو کریج ہوٹل پر ہوتا ہے ادھر تو وہ بس جمعے کو آتا ہے ابھی وہیں ہو گا۔"

"میں نے وہاں فون کیا تھا وہ کہہ رہے تھے وہ وہاں نہیں ہے' وینس برج پر ہے۔"

"اچھا شاید وہ یہاں آ رہا ہو' میرا خیال ہے وہ راستے میں ہو گا۔ آپ بیس منٹ تک کال کر لیں۔" میں نے کھانے اور ڈرنکس کے چارجز کو جمع کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں میں دوبارہ کال نہیں کر سکتی میں نیو کاسل جا رہی ہوں۔ آپ ایک ایڈریس نوٹ کر لیں۔" اس کے کہنے پر میں نے کی بورڈ پر سے انگلیاں ہٹالیں اور نہایت پھرتی سے نوٹ پیڈ اور قلم پکڑ لیا۔

"عماد کو کہیے گا یہ ایڈریس ریحام نے دیا ہے۔" پتہ لکھوا کر اس نے کہا میں نے اس کا نام لکھا اور سلسلہ منقطع ہو جانے پر فون بند کر دیا۔

کیا نام بتایا تھا اس لڑکی نے؟ ریحام؟ میرے ذہن میں اس نوجوان کا فقرہ گونجنے لگا جو اس روز عماد کے ساتھ تھا۔

"اس کو ریحام کی مما کا نام تک معلوم تھا۔" اور پھر عماد نے کہا تھا "اس کا پتہ میرے پاس نہیں ہے تم ریحام سے لے لو۔"

یہ ریحام کون تھی؟ میں نے نوٹ پیڈ اٹھا کر اپنے سامنے رکھا اور اس پر اپنی ہینڈ رائٹنگ میں لکھا گیا پتہ بغور پڑھا جس اسٹریٹ پر موجود پب کا وہ پتہ تھا' وہاں میں ایک دفعہ وہاں ایک مہمان کو پک کرنے گیا تھا میں نے دوبارہ نام پڑھا۔ میڈم کیرن یہی وہ شخصیت تھی جس کو کسی کا نام معلوم تھا' اور اسی عورت کا پتہ حاصل کرنے کے لیے عماد کا دوست بہت بے چین تھا' معلوم نہیں کیا معاملہ تھا میں نے کچھ سوچتے ہوئے عماد کے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ فون پہلی ہی گھنٹی پر اٹھا لیا گیا تھا۔

دوسری جانب سے بغیر کسی سلام دعا کے افتاد نازل ہوئی تھی "میں نے کہا تھا کہ یہاں فون مت کیجیے گا ورنہ میں سچ مچ پولیس کو بلا لوں گی میرے انکل اسکاٹ لینڈ یارڈ میں ہیں' سمجھے آپ؟" لہجہ دھمکی آمیز تھا۔

ایک لمحے کو میں نے حیرانی سے ریسیور کو گھورا' پھر اسے کان پر لگا کر آرام سے بولا "آپ نے مجھے نہیں بتایا تھا۔

ں فون کرنے کی غلطی نہ کرتا۔"
ر ثانیہ وہاں خاموشی چھائی رہی' پھر وہ کچھ معذرت
انداز میں بولی "اوہ آئی ایم سوری دراصل کوئی کافی
فون کرکے تنگ کر رہا تھا۔"
ں وینس برج سے بات کر رہا ہوں عماد ہے؟"
ہ تو کہہ رہا تھا وینس برج جا رہا ہے۔ اس کی جگہ
ں اولڈو کریج پر چلا گیا تھا نا۔"
چھا؟" میں نے دروازے کی جانب دیکھا" وہ آیا تو
۔"
آپ کون بول رہے ہیں؟"
خرم!" مختصرا" جواب دے کر میں فون رکھنا چاہ رہا تھا
یں نے فورا" کہا" اوہ تو آپ خرم ہیں۔ انکل آپ کی
تعریف کرتے ہیں۔" اس نے آپ پر زور دیا۔
تھینکس۔ یہ بلال صاحب میری تعریفیں کیوں
تے ہیں؟"
میں فریا ہوں۔ عماد اور عمر کی بڑی بہن۔" وہ لمبی بات
نے کے موڈ میں تھی۔
عماد آئے تو اسے کہہ دیجئے گا مجھ سے کانٹیکٹ کر
۔" میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ مجھے لڑکیوں سے فون
ں ہانکنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔
ں نے ایک دفعہ پھر اس ایڈریس کو پڑھا۔
رطانیہ میں مستقل سکونت پذیر پاکستانی اور انڈین مسلم
ن تو اہم پرست ہوتے ہیں۔ ان کے گھروں کی
یں جو اکثر شادی کے بعد اپنے برٹش نیشنل خاوندوں
ساتھ رہنے آتی ہیں' ان کے کام کے اوقات سے گھبرا
ہیں۔ شوہر صبح آٹھ بجے سے چار تک کام کرتا ہے' پھر
ٹ ٹائم جاب پوری کرتے ہوئے رات کے آٹھ بجا دیتا
یہ بیویاں سمجھتی ہیں کہ وہ کسی گوری کے چکر میں ہیں۔
ن ہو کر یہ بیویاں پاکستان کے کسی سفلی علم کے ماہر
ر صاحب یا بابا جن کے اشتہارات دی سن اور ڈیلی مرر
میں چھپتے ہیں' جب شوہر گھر آتے ہیں تو بیوی کو تسبیح
میں لیے دیکھ کر کافی خوش ہوتے ہیں۔ ان کا دل تھوڑا
ہ نرم ہو جاتا ہے اور وہ اپنی بیگمات پر زیادہ توجہ دینے
ہیں۔ اس کے بعد یہ خواتین ان باباؤں کا منہ سونے
بھر دیتی ہیں۔ ان باباؤں کے پاس اتنا روپیہ ہوتا ہے کہ
یلی ٹیلی گراف اور دی سن میں اشتہارات چھپوا سکتے
۔

اس قسم کے بابا اور جادوگر صرف بنگالی' ہندو اور مسلم نہیں ہوتے بلکہ یونان اور اٹلی میں ایسے کئی پروفیسرز' میڈمز وغیرہ ہوتی ہیں مجھے نہیں معلوم تھا کہ لیڈز میں بھی کوئی ایسی میڈم رہتی ہے۔ یہ لوگ پڑھے لکھے لوگوں کو بیوقوف بنانے کے لیے ہر طرح کے حربے استعمال کرتے ہیں۔

عماد اور اس کا دوست اور وہ ریحام نامی لڑکی بھی غالبا" دھوکہ کھا گئے تھے میں نے اندازہ لگایا اندازے لگانے میں میں ہمیشہ سے اچھا تھا۔ دروازہ کھلنے کی آواز مجھے حال میں واپس لے آئی' کی رنگ انگلی میں گھماتے ہوئے عماد کوئی دھن زیر لب گنگناتا آ رہا تھا۔

"ہائے بڈی!" وہ مزے سے کہتا ہوا میرے ساتھ والے صوفے پر بیٹھ گیا" کام کیسا جا رہا ہے؟"

"کام کو چھوڑو تمہارے لیے فون آیا تھا۔"

"کس کا؟ سونیا کا؟" وہ بے ساختہ کہہ اٹھا میرے نفی میں سر ہلانے پر اس نے منہ بنایا" پھر؟"

میں نے ایک گہری سانس بھری" ریحام کا۔"

"ہنی کا! اس نے کیوں کیا فون؟" وہ حیران ہوا۔

"تمہارا پوچھ رہی تھی کہہ رہی تھی' نیو کاسل جا رہی ہے۔ ایک پتہ لکھوایا ہے۔" میں نے کاغذ اس کی جانب بڑھا دیا۔ میری لکھائی میں لکھا ہوا پتہ پڑھ کر اس کا رنگ ایک دم متغیر ہو گیا۔" یہ تم نے کسی کو دکھایا تو نہیں ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"مجھے حیرت ہے عماد' تم اس قسم کے لوگوں پر یقین کرتے ہو۔ یہ میڈمز فراڈ ہوتی ہیں۔"

"ناٹ دس ون۔" اس نے نفی میں سر ہلایا اس کی آواز میں ایک نامعلوم سی بے چارگی تھی۔

"تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"جس لڑکی نے تمہیں فون کیا تھا' اس کا نام ریحام ہے۔ میں رضا اور ریحام بچپن کے فرینڈز ہیں۔ ریحام کی بڑی بہن امل کو یونیورسٹی میں ایک مصری لڑکا ملا۔ صرف چار روز کی ملاقات کے بعد اس نے اس سے شادی کر لی اور گھر والوں سے الگ ہو گئی۔ وہ اپنا الگ فلیٹ لے کر رہنے لگی۔ وہ مصری لڑکا وہاں سے واپس مصر چلا گیا۔ امل اپنی جیولری بیچ کر اپنے شوہر کو پیسے بھجوانے لگی۔ اس کے والدین نے اسے بہتیرا سمجھایا کہ وہ اس لالچی لڑکے کو چھوڑ دے مگر وہ نہ مانی۔ وہ لڑکا برابر اس سے پیسے منگواتا رہا۔ امل نے اپنے والدین سے ملنے سے بھی انکار کر دیا۔"

پھر ایک روز ریحام' ہنی کی ممی کو کسی نے میڈم کیرن کا بتایا۔ جب ہنی اور آنٹی اس کے پاس گئیں تو میڈم نے آنٹی کو ان کے نام سے پکارا میڈم واقعی پہنچی ہوئی ہیں میڈم نے کہا کہ وہ کچھ دنوں میں گھر آ جائے گی اور ایسا ہی ہوا۔"

"پچھلے دنوں رضا اور اس کی منگیتر کے درمیان کوئی چپقلش ہو گئی۔ رضا کو لگتا ہے اس کی منگیتر اب اس کو پسند نہیں کرتی۔ وہ اب رضا سے شادی نہیں کرنا چاہتی' رضا اس سے واقعی محبت کرتا ہے۔ اب وہ مجھ سے اور ہنی سے میڈم کیرن کا ایڈریس مانگ رہا ہے تاکہ وہ اس سے جا کر عاشی کے بارے میں پوچھے۔"

"تو رضا اس سے خود پوچھ لے۔" میں نے مسئلے کا حل بتایا۔

"وہ پوچھ چکا ہے' وہ کچھ نہیں بتاتی۔"

"پلیز عماد! اس کو میڈم کیرن کا پتہ مت دینا۔ وہ وقت ضائع کرے گا یہ لوگ فراڈ ہوتے ہیں۔"

عماد نے سر ہلا دیا مگر میں جانتا تھا کہ وہ یہ ایڈریس رضا کو ضرور دے گا۔ حد تھی توہم پرستی کی' دل ہی دل میں میں نے میڈم کو کئی گالیاں دے ڈالیں۔

☼ ☼ ☼

ڈور بیل بجائے چند سیکنڈ ہی ہوئے تھے کہ دروازہ کھول دیا گیا۔ سامنے جو چہرہ نظر آیا اسے دیکھ کر میں نے ایک لمحے کو سانس لینا بھول گیا۔

اس کی سبز آنکھوں پر لانبی پلکوں کا سایہ تھا۔ اس کے سنہری مائل بھورے بال سنہری جلد کے ساتھ بہت بھلے لگ رہے تھے۔ ان ہونٹوں پر کوئی لپ اسٹک نہیں تھی' مگر وہ بہت سرخ تھے۔ بلیو جینز کے اوپر میرون ٹی شرٹ اور گلے میں لاپروائی سے ڈالے گئے اسکارف میں کھڑی وہ لڑکی بہت خوب صورت تھی۔

میں خوب صورتی سے متاثر ہونے والوں میں سے نہیں تھا۔ صرف ایک لمحے کو میں مبہوت ہوا تھا' پھر فورا" سنبھل کر مسکرا دیا۔ "السلام علیکم!"

"وعلیکم السلام۔" وہ خوش دلی سے بولی "آپ خرم ہیں!"

"جی!" میں نے مسکراہٹ کو قدرے کم کر کے اپنی ازلی بے نیازی اور مغرورانہ پن کو چہرے پر طاری کیا۔

"میں فریا ہوں آپ سے ایک روز فون پر بات ہوئی تھی!"

"جی مگر آپ نے یہ نہیں بتایا تھا کہ آپ گھر آئے مہمانوں کو دروازے پر ہی سے ٹرخا دیتی ہیں۔"

وہ خفیف سی ہو کر بولی "اوہ آئی ایم سوری! آپ اندر آئیں۔" میں مسکرا دیا اور اس کے پیچھے اندر چلا آیا۔

آٹھ بیڈ رومز پر مشتمل وہ گھر بہت بڑا تھا' مگر پانچ منٹ بعد ہی مجھے عماد کی بات یاد آ گئی جو اس نے ایک دفعہ ایسے ہی کہی تھی "ہمارا گھر بہت چھوٹا ہے۔" اس نے بالکل سو بلکہ ایک ہزار فیصد درست کہا تھا۔ اس گھر کے مکینوں کے لیے واقعی وہ گھر بہت چھوٹا پڑتا ہو گا۔

چونکہ بلال احمد اور ان کے دونوں بھائی اختر اور مدثر احمد ایک ہی گھر میں اکٹھے رہتے تھے' اس لیے اس گھر میں اتنے بچے تھے' اتنے بچے تھے کہ خدا کی پناہ۔ ہر سائز' ہر عمر کے بچے سب سے بڑی لڑکی صفوان کی بہن عالیہ تھی اور سب سے چھوٹا ابوبکر مجھے تو یہ بھی یاد نہیں کہ کون کس کا بھائی' بہن تھا بس ان گنت مکین تھے ان کے گھر میں۔

میں جیسے ہی لاؤنج میں داخل ہوا' عماد کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی "فریا' فریا سمل کا فون ہے۔" ایک لمحے کو میرے قدم ڈگمگائے تھے' مگر پھر میں فورا" سنبھل گیا۔ اس دنیا میں ایک نام کے کئی لوگ ہوتے ہیں' میں نے فریا کو تیزی سے فون اسٹینڈ کی جانب جاتے ہوئے دیکھ کر سوچا۔

میں پہلی دفعہ عماد کے والد اور مدثر احمد سے مل رہا تھا وہ مجھ سے بہت زیادہ گرم جوشی سے ملے۔ میں تھوڑا سا کنفیوز ہو گیا۔ میں بس ایک عام سا پاکستانی لڑکا تھا جو ان کے ہوٹل پر ملازمت کرتا تھا۔ پھر وہ مجھ سے اتنے اچھے سلوک سے پیش کیوں آ رہے تھے؟

کافی دیر تک بلال احمد اپنے گھر والوں کو بتاتے رہے کہ خرم کتنا سمجھ دار اور اچھا بچہ ہے۔ جبکہ میں بے گناہ ملزموں کی مانند نگاہیں فرش پر مرکوز کیے دل ہی دل میں اس منحوس گھڑی کو کوستا رہا جب میں نے ان کی دعوت قبول کی تھی۔

کھانے کے لیے ڈائننگ ہال میں جاتے ہوئے میرے کان میں عماد کی کسی کزن کی سرگوشی پڑی جو دھیرے سے حیدر سے مخاطب تھی۔

"بہت مغرور لگتا ہے' مگر ہے بہت ہینڈسم۔"

"فریا آپی کے ساتھ پرفیکٹ ہے۔ کتنا اچھا کپل بنے گا نا' بلال انکل بھی کل یہی کہہ رہے تھے۔"

میرا سر گھومنے لگا۔ خدایا یہ نوازشیں' عنایتیں' مہمان نوازیاں یہ سب اپنی غرض کے لیے تھا؟ وہ میرے بارے میں خود ہی کون سے فیصلے کر بیٹھے تھے۔

کھانے کی میز پر مدثر احمد نے مجھ سے پوچھا "تم آگے کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"میں تو بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ میرا ایم بہت سے ہوٹلز بنانا ہے۔"

"تمہیں ہوٹلز بنانے کا شوق ہے یا پیسہ کمانے کا؟"

"مجھے پیسہ چاہیے۔ کیونکہ میں جس کی وجہ سے پاکستان چھوڑ کر یہاں آیا ہوں' وہ دولت کا حصول ہی ہے۔" میں نے دیکھا سب کی توجہ میری طرف تھی۔

"ویسے تمہیں جلد ہی بہت مواقع ملیں گے" مدثر احمد بولے "تم بریڈ فورڈ چھوڑ کر لیڈز کیوں آگئے؟"

"لمبی کہانی ہے۔" میں نے دل ہی دل میں "لمبی کہانی" تیزی سے سوچنا شروع کر دی۔

"بتائیں نا خرم بھائی۔" حیدر دلچسپی سے بولا۔

"جس خاتون سے میں نے جا کر قرضہ مانگا تھا' وہ مجھ میں انٹرسٹڈ ہو گئی میں نے یہ کہہ کر کہ کسی اور میں انٹرسٹڈ ہوں' وہ جاب چھوڑ دی اور بددل ہو کر بریڈ فورڈ سے یہاں آ گیا۔" میں نے جھوٹ بولا۔

میری بات پر ایک زبردست قہقہہ پڑا تھا "کس کس سے جھوٹ بولیں گے آپ؟" فاطر بولا۔

"جھوٹ؟" میں نے مصنوعی حیرت سے اس کو دیکھا "میں پاکستان میں ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ اس کا باپ بہت امیر تھا۔ میرے پاس پیسہ نہیں تھا میں اسی لیے انگلینڈ آیا ہوں تاکہ پیسہ کماؤں' پاکستان واپس جاؤں اور اس سے شادی کر لوں۔ میں نے جھوٹ تو نہیں کہا۔ میں واقعی کسی کے ساتھ کمٹڈ ہوں۔"

ڈائننگ ہال میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔ عماد کے ابو بے یقینی سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ باقی سب کی بھی ایسی ہی حالت تھی خود عماد کا منہ آدھا کھل گیا تھا۔ فریا کی آنکھوں میں بلا کی حیرت تھی۔

"تم نے پہلے تو نہیں بتایا۔" بلال احمد نے پوچھا۔

"میں کیوں بتاتا؟ اٹس ویری پرسنل۔ اب اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ نے مجھے گھر پر انوائٹ کر کے آنر دیا ہے۔ میں نے کوئی بہت شاکنگ بات کہہ دی ہے کیا؟"

چند ثانیے میں کمرے میں موجود نفوس کے حیرت اور الجھن و تفکرات سے بھرے چہرے دیکھتا رہا پھر کچھ رک کر ایک جھٹکے سے اٹھا اور بولا۔

"سر شاید آپ مجھے غلط سمجھے۔"

اتنا کہہ کر میں رکا نہیں بلکہ لمبے لمبے ڈگ اٹھاتا ہوا اس اٹالین طرز کے خوب صورت گھر سے باہر نکل آیا۔

مجھے عماد بہت پسند تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس سے میری یہ آخری ملاقات تھی۔ پرسوں جا کر مجھے ریزائن کرنا تھا اور نئی جاب ڈھونڈنا تھی۔

دکھ' صدمہ' رنج' ملال اور غصہ سب کچھ میں اپنے اندر محسوس کر رہا تھا۔ میرا خیال تھا میری قابلیت اور محنت دیکھ کر مجھے ٹرائل پر رکھنے کے بعد مستقل جاب دے دی گئی تھی۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ اب بھی مجھے ویسا ہی سمجھا گیا ہے جیسے اسلام آباد میں سمجھا گیا تھا۔ لالچی اور مکار۔ اگر مجھے اس طرح دولت حاصل کرنا ہوتی' تو شیخ جہانگیر کے پاس اس کی کمی نہیں تھی۔ اگر میں پاکستان چھوڑ کر آیا تھا تو اس لیے کہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کر سمل کی آرزوئیں اور امنگیں پوری کر سکوں۔ میں تو اپنے خواب ڈھونڈنے آیا تھا' مگر لوگ کیوں اتنے خود غرض ہوتے ہیں۔

"کیا مصیبت ہے" میں نے زور سے بیئر کے خالی کین کو ٹھوکر ماری اور وہیں فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔

جگہ کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی میں نے ذہن پر تھوڑا سا زور ڈالا تو فوراً" یاد آگیا۔ اس اسٹریٹ کا نام ہیر ہلز تھا۔ ہیر ہلز کے آس پاس کی کوئی جگہ تھی' کوئی خاص جگہ جس کا اسم گرامی میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔

تب ہی میری نظر سامنے مختلف ریسٹورینٹس میں گھرے ایک قدیم اور پرانا سا لکڑی کے پب پر پڑی اس کے باہر ایک خستہ حال لکڑی کے بورڈ پر میڈم کیرن لکھا تھا۔ میرے لبوں پر بے ساختہ ہی ایک مسکراہٹ پھیل گئی۔

ذہن میں میڈم کیرن کی پب کا نقشہ بالکل اینڈرسن کی کسی فیری ٹیل جیسا آیا تھا۔ میڈم کوئی ستر اسی برس کی جھریوں بھرے چہرے کی مالک خاتون ہو گی جس کے سفید بال خوفناک طریقے سے بکھرے ہوں گے۔ اس کے ایک نوک دار کالی ٹوپی اور جسم پر لمبا' سیاہ لبادہ ہو گا۔ ناک لمبی اور سامنے کے دانت کالے ہوں گے۔ لمبے لمبے ناخنوں پر سرخ نیل پالش لگی ہو گی۔

With Coconut Oil and Conditioner
SKINCARE Skincare Company Pakistan.

تب ہی کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا تو میں نے چونک کر پیچھے دیکھا۔

ایک لمبا' سوکھا سڑا ہوا گورا' مجھے مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا "تمہارا نام خرم ہے؟" وہ سرد لہجے میں پوچھنے لگا۔

میرے چہرے سے مسکراہٹ ایک دم غائب ہو گئی تھی۔

"تم کون ہو؟"

"میرے ساتھ آؤ۔" وہ میرا سوال نظرانداز کرکے بولا۔

"تمہیں پب میں میڈم کیرن بلا رہی ہیں۔" میرے دماغ میں ایک دم کئی دھماکے ہوئے تھے میں تو کسی بھی طرح سے میڈم کیرن کو نہیں جانتا تھا' پھر اس کو میرا نام کیسے معلوم ہوا۔

"میرا دماغ پہلے ہی کئی الجھنوں میں گھرا تھا۔ میری نوکری چھوٹ گئی تھی' جیب خالی تھی مگر اوپر سے ایک نئی ٹینشن نے آن گھیرا۔

"آؤ۔" وہ تھوڑی کرختگی سے بولا۔

"کیوں؟" میرے استفسار پر اس نے ڈھٹائی سے شانے اچکا دیے اور سڑک کے دوسری جانب جانے لگا۔ دو قدم رک کر اس نے مڑ کر میری جانب دیکھا میں تو تیزی سے اٹھا اور ایک معمول کی طرح اس کے پیچھے ہولیا۔

اندر سے وہ کوئی اتنی خستہ حال پب نہ تھی۔ اچھی خاصی ماڈرن تھی۔ وہ "لمبو" مجھے ایک کونے والی میز پر لے گیا اور روکھے لہجے سے بیٹھنے کو کہا تھوڑی دیر بعد وہ ایک بڑا سا سلور کا پیالہ لے آیا جس میں پانی بھرا تھا۔ اس نے وہ پیالہ بڑے احترام سے میرے آگے رکھا۔ (یہ احترام غالباً" پیالے کے لیے تھا) پھر اسی لہجے میں بولا۔

"تھوڑا انتظار کرو میڈم آ رہی ہیں۔" وہ دوبارہ اسی کمرے میں غائب ہو گیا جہاں سے پیالہ لایا تھا۔

میں نے کچھ آگے کو جھک کر اس سلور کے پیالے کو بغور دیکھا۔ اس کے پیندے پر کسی اور زبان میں کچھ لکھا گیا تھا یا پھر شاید وہ ڈیزائن تھا۔ ایسے جیسے ایک چھوٹے دائرے کے گرد تھوڑا بڑا دائرہ' اس کے گرد اور بڑا اسی طرح پانچ دائرے سے بنے تھے۔

میرے ساتھ والی کرسی پر ایک عورت آ کر بیٹھ گئی۔ شاید ویٹرس ہو میں نے سوچا اور نہایت بے چینی سے میڈم کیرن کا انتظار کرنے لگا۔ جو عورت میرے قریب بیٹھی تھی' اس کی عمر تیس بتیس کے لگ بھگ ہو گی اپنے بالوں کو اس نے نہایت نفاست سے جوڑے کی شکل میں باندھ رکھا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں اپنی اسکرٹ بلاؤز کی طرح شفاف کرے تھیں۔ جیسے کانچ کی بنی ہوں۔ اس کی سنہری رنگت پر وہ آنکھیں بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر اتنی شگفتگی تھی کہ بے اختیار میری نظریں اس پر جم گئیں میرے یوں دیکھنے پر وہ مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ بہت نرم تھی۔ مسکرانے سے اس کی آنکھوں کے گرد دھیمی دھیمی سی لکیریں پڑ گئی تھیں۔ وہ اپنی مدھم آواز میں بولی۔

"میرا نام میڈم کیرن ہے۔ تم سڑک پر کیوں بیٹھے تھے۔ ادھر میرے پاس آجاتے۔"

میں مبہوت سا ہو کر اس کو دیکھے گیا۔ وہ کوئی جادوگرنی ٹائپ عورت تو ہرگز نہ لگ رہی تھی' بلکہ اس کی شخصیت سے ایک نفاست اور وقار جھلکتا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو' خرم!" اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ان آنکھوں میں نجانے کیا سحر تھا کہ میں وہاں دیکھتا ہی رہ گیا۔ میں اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا' کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا اس کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟ اسے ریحام کی امی کا نام کیسے پتہ چلا؟ وہ کیوں معصوم لوگوں کو دھوکہ دے رہی تھی۔ سب جانتے ہیں کہ وہ فراڈ ہے' وہ اس سب کے باوجود بھی لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونک رہی تھی کیوں؟ اب مجھے ادھر بلا کر وہ کون سا نیا گیم کھیلنا چاہ رہی تھی۔ میں بہت کچھ بولنا چاہتا تھا' مگر الفاظ تو جیسے حلق میں اٹک کر رہ گئے تھے۔ میں نے لب کھولے' مگر آواز اندر ہی کہیں گھٹ گئی تھی۔

"یہ پانی پیو۔" اس نے شفقت بھرے لہجے میں سلور کے کٹورے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں جانتا تھا کہ وہ بہروپ ہے' ڈرامے کرکے پیسے بٹورنا چاہ رہی ہے۔ اگر یہ بے رنگ مائع جسے وہ پانی کہہ رہی ہے' پانی کے بجائے کچھ اور ہوا۔ جو مجھے بے ہوش کردے بلکہ مار بھی دے تو کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ اس شہر میں تو ویسے ہی مجھے کوئی نہیں جانتا تھا جو جانتے تھے ان کی نوکری میں نے چھوڑ دی تھی۔ میرے دماغ میں کہیں سے کوئی آواز آ رہی تھی۔ مجھے کوئی بھاگ جانے کا کہہ رہا تھا' خطرے کی گھنٹی کہیں دور سے سنائی دے رہی تھی۔ مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے' میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا۔

مگر وہ میرے ہی ہاتھ تھے جو بڑھے تھے' وہ میری ہی انگلیاں تھیں جنہوں نے اس پیالے کو تھاما تھا' اور وہ میرے ہی لب تھے جنہوں نے اس پانی کو اپنے حلق میں انڈیلا تھا۔ اس کا ذائقہ بالکل پانی جیسا تھا۔ میڈم کی ہدایت کے مطابق میں نے آدھا کٹورا پی کر باقی واپس رکھ دیا۔

میڈم کیرن جھک کر اس بے رنگ مائع میں کچھ دیکھنے لگی۔ پانچ چھ منٹ کے بعد اس نے سر اٹھایا' اب کے وہ بولی تو اس کی آنکھوں اور لہجے میں ایک گہرا غم جھلک رہا تھا۔

"وہ اب بھی اپنے ڈاری کا انتظار کرتی ہے۔ وہ اب بھی اپنے ڈاری کے لیے روتی ہے۔"

مجھے اس کا ایک لفظ بھی سمجھ میں نہ آیا وہ کس کی بات کر رہی تھی۔

"وہ سمجھتی ہے تم نے اسے دھوکا دیا۔ وہ سمجھتی ہے کہ تم لالچی ہو۔ تم نے کوئی وضاحت کیوں نہ پیش کی؟" وہ تاسف انگیز لہجے میں بولی۔

"کون...؟" میرے لبوں سے نکلا۔

میڈم کیرن نے سر اٹھایا اور اپنی کانچ سی آنکھوں سے میری بھوری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔

"وہی جو اس دنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی ہے۔"

"سمل..." بے اختیاری میں کہہ اٹھا۔

"تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"آپ نے اس لڑکے کو بھیج کر بلوایا تھا۔"

"نہیں' میرا مطلب ہے انگلینڈ کیوں آئے تھے؟"

"پیسہ کمانے۔" میں نے خود کو کہتے سنا۔

"نہیں' تم اس کے ایک چھوٹے سے خواب کی تکمیل کے لیے ڈھیر ساری دولت حاصل کرنا چاہتے تھے اس لیے تم یہاں آئے تھے' تاکہ اس کی باپ کے اسٹیٹس تک پہنچ کر اس کا ہاتھ مانگ سکو۔"

"میرے اپنے بھی خواب ہیں۔"

"اس کا خواب تمہارے خوابوں پر غالب آ گیا تھا تمہارے خواب تمہیں کھینچ کر انگلینڈ نہیں لائے' تمہیں اس کی ایک آرزو یہاں لائی ہے۔ مگر وہ اتنا بڑا خواب تو نہ تھا کہ تم اس کا دل توڑ دیتے۔"

"میں نے..."

"تم نے کوئی وضاحت نہ دی' اسے انتظار کرنے کو بھی نہ کہا۔ اتنا تو کہہ دیتے کہ میرا انتظار کرنا۔"

"میں سچا تھا' سچے لوگ وضاحتیں نہیں پیش کرتے' صفائیاں نہیں دیتے۔ اگر اس کو میری محبت کا اعتبار ہے تو وہ میرا انتظار کرے گی۔" میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

"تم نے یہ نہ سوچا کہ اس کی شادی ہو گئی تو....؟"

"نہیں.... اگر وہ مجھ سے محبت کرتی ہے تو وہ میرا انتظار کرے گی۔"

"تمہارا انتظار؟"

"اس وقت کے آنے کا انتظار جب میں اپنے قدموں پر کھڑا ہوں گا۔"

وہ چند ثانیے میری طرف دیکھتی رہی' پھر دوبارہ جھک کر پیالے میں دیکھنے لگی۔

"کیا دیکھ رہی ہو' میڈم؟"

"دیکھ رہی ہوں کتنا انتظار کرنا پڑے گا تمہیں...." وہ پانی کو دیکھتی رہی' بے تاثر چہرہ لیے اس کی جھکی آنکھوں کو دیکھتا رہا وہ کتنا کچھ جانتی تھی' وہ سب بھی' جو میں بھی نہ جانتا تھا۔ ایک دم ہی اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ حیرت اور خوف سے اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر میری جانب دیکھا۔

"نہیں.... نہیں...." وہ خوف زدہ سی آواز میں بولی۔

"کیا ہوا میڈم؟" میں نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

"نہیں.... نہیں.... خرم' واپس چلے جاؤ۔ جاؤ چلے جاؤ۔"

"کیوں؟" میں نے بے چینی سے اسے دیکھا۔

"نہیں خرم! اس سے پہلے کہ تم اپنی محبت کے جگنو گم کردو' اپنے خواب مٹی میں ملادو۔ یہاں سے چلے جاؤ' ورنہ انتظار بہت لمبا ہے۔ نہیں' تم چلے جاؤ۔" وہ جھٹکے سے اٹھی اور زور سے چیخی۔

"گو بیک....."

اتنا کہہ کر وہ بھاگتی ہوئی اس دروازے میں گم ہو گئی جہاں سے آئی تھی۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے میں پب سے باہر نکل آیا۔

زندگی میں پہلی بار میں خوف زدہ ہوا تھا۔

(دوسری اور آخری قسط آئندہ ماہ)

دوسری اور آخری قسط

چونکہ اگلے روز اتوار تھا' اسی لیے پیر کی صبح میں بلال احمد کے دفتر چلا گیا۔
"سر یہ میرا ریزیگنیشن ہے۔" میں نے تہہ کیا ہوا کاغذ ان کی میز پر رکھا' مڑا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ مگر ان کی آواز نے دفعتاً میرے قدم روک دیے۔
"واپس آؤ۔"
بادلِ نخواستہ ہی میں واپس کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔
"تم دن بدن زیادہ مغرور نہیں ہوتے جا رہے؟" ان کے کہنے پر میں نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا' وہ مسکرا رہے تھے۔
"آپ نے مجھے غلط سمجھا ہے۔"
"میں نے تمہیں کچھ بھی نہیں سمجھا۔ اس دن ایویں تم غصہ میں اٹھ کر چلے آئے۔ وہ عماد ہے نا' اس وقت سے کہہ رہا ہے کہ انکل' آپ نے اس اکڑو خان کو ناراض کر دیا ہے حالانکہ میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔"
"آپ نے نہیں کہا تھا مگر......"
"جب میں نے ہی کچھ نہیں کہا تو تم کیوں ناراض ہو رہے ہو؟ آرام سے واپس آکر کام سنبھالو۔"
"لیکن سر......!"
"اوئے...... مجھے تمہارے جیسا ورکر پورے شہر میں نہیں ملے گا۔ آرام سے جا کر سیٹ پر بیٹھو۔" انہوں نے اس بار قدرے ڈانٹ کر کہا۔ تو میں مسکرا دیا۔
"اچھا مگر میری ایک شرط ہے۔"
"کیا؟"
"مجھے تیس لاکھ پاؤنڈز قرضہ چاہیے۔"
"فوراً"؟"
"فوراً!" میں نے مسکرا کر کہا۔
"بینک سے یا......؟"
"بینک سے نہیں۔ آپ سے یا کسی اور امیر آدمی سے جس کے پاس اتنا پیسہ فالتو پڑا ہو۔"
"میرے پاس سے تمہیں......" انہوں نے ایک لمحہ کو رک کر میری طرف دیکھا' پھر مسکرا کر بولے "مل سکتا ہے۔"

میں بے ساختہ ہی ہنس دیا۔
میری ایک مشکل تو کسی حد تک آسان ہو ہی گئی تھی۔ پتہ نہیں کیوں میڈم کیرن نے مجھے یہاں سے چلے جانے کو کہا تھا۔

☼ ☼ ☼



میڈم کیرن کے پاس سے آنے کے بعد میں نے اپنے ایک کمرے کے فلیٹ میں نہایت بے چینی سے رات گزاری تھی۔
میڈم کو یہ سب کیوں اور کیسے پتہ تھا؟ میرے پاس یہ سوچنے کے لیے وقت نہ تھا۔ مجھے یسمل کی فکر تھی۔ وہ مجھے اچھی سمجھنے لگی تھی۔ اس کے لیے میں ملک چھوڑ کر یہاں آیا تھا۔ میں اس کے برابر پہنچنا چاہتا تھا۔ مگر مجھے کم از کم اسے فون تو کر لینا چاہیے تھا' کسی طرح اس کی خبر گیری تو کرنی چاہیے تھی۔ مجھے یہاں آئے ڈیڑھ ماہ ہو گیا تھا' مگر میں نے ایک دفعہ بھی اس سے بات نہ کی تھی۔ کیوں؟ دل نے پوچھا تھا۔
کیونکہ تمہیں اپنے مقصد کا خیال تھا۔ دماغ نے جواب دیا تھا۔ کیونکہ تم خوف زدہ تھے کہ اگر اسے کال کر لیا تو تمہارا دماغ وہیں اٹک جائے گا اور تم یکسوئی سے کام نہیں کر سکو گے۔ تم بزدل نہیں' اصول پسند ہو۔
کیا محبت میں بھی اصول ہوتے ہیں؟ دل نے پوچھا تھا۔
محبت میں اصول نہ ہوں لیکن معاشرے میں تو ہوتے ہیں۔ اور میں اس کا سامنا تب کروں گا۔ جب میں خود کسی قابل ہوں گا اور کسی قابل بننے کے لیے مجھے اپنے ہوٹلز بنانا تھے۔ بلکہ ہوٹلوں کی ایک پوری چین۔
دو روز بعد سب کام سے فارغ ہو کر میں نے یلو پیجز نکالے اور ریئل اسٹیٹ بروکرز کے نمبر تلاش کرنا شروع کر دیے۔ سب سے بڑا بروکر "وارنز اینڈ ایسوسی ایٹس" تھا۔
اس کا نمبر ملا کر میں نے مسٹر وارنز سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی۔
"کون بات کر رہا ہے؟" دوسری جانب سے مسٹر وارنز کے سیکرٹری نے پوچھا تھا۔
"خرم زید۔"
چند منٹ بعد مسٹر وارنز لائن پر آگئے۔
"میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں؟"
"مسٹر وارنز! میں ایک ہوٹلیئر ہوں اور فی الحال ایک خوب صورت ہوٹل تعمیر کرنے کے لیے ایک اچھی لوکیشن ڈھونڈ رہا ہوں۔" میں نے بتایا۔
"پھر تو آپ نے بالکل صحیح جگہ پر فون کیا ہے۔ ہم اس کام میں ماہر ہیں۔ ویسے کوئی مخصوص جگہ ہے آپ کے ذہن میں؟"
"نہیں تو!"
"خیر' یہ کام تو ہمارا ہے۔ آپ سب کچھ ہم پر چھوڑ کر یہ بتائیں کہ تقریباً" کتنا اماؤنٹ ہوگا آپ کے پاس؟" وہ خوش اخلاقی سے پوچھنے لگا۔
"تین ملین پاؤنڈز۔" میں نے تفاخر سے کہا۔
چند ثانیے وہ خاموش رہا' پھر مدھم سی آواز میں بولا۔
"تین ملین؟"
"جی۔"
"اور آپ کوئی خوب صورت ہوٹل تعمیر کرنا چاہتے ہیں؟"

"جی ہاں۔"
"خوب صورت ہوٹل سے مراد اندرون شہر میں کوئی سستا سا ہوٹل ہے؟"
"بالکل بھی نہیں۔"
"تب تو ہم آپ کی مدد نہیں کر سکتے مسٹر زید!"
"مگر کیوں؟"
"دیکھئے مسٹر زید! تین ملین بہت تھوڑی رقم ہے۔ اس سے صرف کوئی عام سا ہوٹل ہی بن سکتا ہے۔"
"آپ کا بہت بہت شکریہ۔" میں نے کہا اور فون کریڈل پر رکھ دیا۔ خوامخواہ ہی کسی غلط بروکر کو فون کر دیا ہونہہ! میں نے ناک سکیڑتے ہوئے سوچا تھا۔
اگلے آدھے گھنٹے میں بیسیوں بروکرز کو فون کرنے کے بعد مجھے اس تلخ حقیقت کا اندازہ ہو گیا تھا کہ تین ملین پاؤنڈز جو کہ تیس کروڑ روپے سے اوپر ہوتے ہیں' اس میں کوئی اچھا ہوٹل نہیں بن سکتا تھا۔
مگر مجھے بنانا تھا۔ ایک خوب صورت سا منفرد طرز کا ہوٹل' ایک دو گھنٹے کے لیے میں ہوٹل سے کھسک کر "فار سیل" ہوٹلز دیکھنے چلا گیا۔ کئی فار سیل ہوٹلز کے ریئل اسٹیٹ بروکرز سے بھی ملا۔
"اس ہوٹل کی قیمت کیا ہوگی؟" ہر دفعہ یہ پوچھنے پر ملنے والے جواب ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود ایک جیسے تھے۔
"اس ہوٹل کی قیمت ساٹھ ملین پاؤنڈز ہے۔"
"اسی ملین پاؤنڈز......"
"پچاسی ملین پاؤنڈز......"
"پچانوے ملین پاؤنڈز......" سب جواب ایک جیسے ہی تھے۔ مایوس کن
میرے تین ملین اب بہت ہی حقیر محسوس ہو رہے تھے۔

اور پانچ ملین ڈاؤن پے منٹ کے ہوں گے۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا۔

"یہ تو بہت زیادہ ہے۔" میں نے نفی میں سرہلایا۔ مسز فریڈرک نے کندھے اچکا دیے۔ میرا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔

کچھ دیر تک میں دل ہی دل میں جمع تفریق کرتا رہا۔ بالآخر میں نے سر اٹھایا اور مسکراتے ہوئے بولا "مجھے منظور ہے۔"

"گڈ!"

"اور میں تمہیں تین ملین ڈاؤن پے منٹ کے دوں گا۔"

"نہیں مجھے پانچ ملین ہی چاہئیں۔"

"تو میں نے کب کہا ہے کہ تمہیں پانچ ملین نہیں ملیں گے۔"

"تم نے خود ہی تو کہا ہے کہ تم تین ملین دو گے؟"

"میں تین ملین دوں گا نا، مگر ڈاؤن پے منٹ پانچ ملین ہی ملے گی۔"

اب کے اس نے مجھے کچھ الجھ کر دیکھا۔ "اور باقی کے دو ملین؟"

"وہ تم دو گی۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" وہ بے یقینی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"تم مجھے ہوٹل کی سیکنڈ مورٹیج کے بدلے میں دو ملین دو گی، اس طرح وہ دو، اور میرے تین مل کر ڈاؤن پے منٹ پوری کردیں گے! رائٹ؟"

"تمہارا دماغ تو صحیح ہے! تم میرا ہی ہوٹل خریدنے کے لیے مجھ سے ہی ادھار مانگ رہے ہو؟"

"بالکل۔" میں نے آرام سے کہا۔

"اور میں کیوں سیکنڈ مورٹیج دوں گی؟" وہ ابرو چڑھا کر پوچھنے لگی۔

"کیونکہ تمہارا کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ جب تک میں رقم ادا نہیں کروں گا، تم ہوٹل کی مالکن رہو گی۔ تم ایسے دیکھو کہ تم خود ہی کو ادھار دے رہی ہو۔" میں نے میز پر قدرے جھک کر کہا۔

وہ کافی دیر تک سوچ میں ڈوبی رہی۔ بالآخر اس نے لب کھولے۔

"یو آر اے ویری اسمارٹ پرسن بٹ یو ہیو دی ڈیل!"

✻ ✻ ✻

"تو سودا طے ہو گیا؟" میری شکل دیکھ کر ہی انہیں معلوم ہو گیا تھا۔

"جی سر!" میں ان کو تفصیلات بتانے لگا۔

"اب تم اس ہوٹل کا کیا کرو گے؟" بلال احمد پوچھنے لگے۔

"میں اس کو ری بلڈ کروں گا۔ سب کچھ بدل ڈالوں گا۔" میرا لہجہ پرعزم تھا۔ "آپ دیکھیے گا، وہ لیڈز کا سب سے خوب صورت ہوٹل بن جائے گا۔"

"آئیڈیا اچھا ہے، ویسے دماغ تمہارا بہت چلتا ہے۔" وہ مسکرائے۔

"تھینکس سر! ویسے بینک مجھے لون دے دے گا؟"

"ہاں ایک بینک میں میرا بہت اچھا دوست کام کرتا ہے۔ تمہارا کام ہو جائے گا۔"

پھر جس روز انہوں نے مجھے لون مل جانے کی نوید سنائی، اس شام وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ تمام گھر والے بہت تپاک سے ملے فریا بھی میری اچانک آمد پر بہت خوش تھی، البتہ فریا کی امی کا رویہ کسی بھی جوش سے خالی تھا۔ انہوں نے مروتاً ہی خوش آمدید کہا۔ انہیں شاید "ہونے والے داماد" کے ہاتھ سے نکلنے کا غم تھا۔

ان کے دو بھائی مجھے کہیں نظر نہیں آئے تھے، نہ ہی عماد، صفوان یا عمر میں سے کوئی تھا۔ یوں کافی دیر تک بیٹھے فیوچر پلانز ڈسکس کرتے رہے۔

✻ ✻ ✻

میں نے جس آرکیٹیکٹ کو ہائر کیا تھا وہ شہر کا مشہور آرکیٹیکٹ تھا۔ قریباً ایک ہفتے کی محنت کے بعد اس نے نقشہ تیار کر لیا۔ ہوٹل میں ایک سو پچاس کمرے تھے سوئٹس کی شکل میں ڈھل جانے کے بعد محض 65 رہ گئے تھے۔ ڈیلکس رومز صرف پندرہ رکھے تھے ہر کمرے میں ایک آتش دان اور گرینڈ پیانو کا انتظام کیا گیا تھا۔

میں ٹھیکے دار سے ملا اور تمام معاملات طے کر لیے۔

"بائی دے وے، ہوٹل کا نام آپ چینج کریں گے؟"

"ہاں بالکل۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ اپنے سرنیم کے مطابق "زید پیلس یا زید پلازہ" رکھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ....." وہ اپنی پسند کے نام گنوا رہا تھا مگر مجھے کچھ اور یاد آ رہا تھا۔

میں نے کنٹریکٹر کی جانب دیکھا اور آہستہ سے مسکرایا۔

"ہوٹل کا نام sky high ہو گا۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" وہ محض شانے اچکا کر رہ گیا۔

✻ ✻ ✻

"صفوان! ٹی وی کی آواز اونچی کرو۔" عماد نے غصے سے صفوان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"نہیں کرتا کیا کر لو گے؟" صفوان نے ڈھٹائی سے جواب دیا تو عماد نے خود اٹھ کر آواز اونچی کی اور بڑے انہماک سے میچ دیکھنے لگا۔ وہ دونوں میرا سر کھانے کے لیے ہوٹل آئے ہوئے تھے۔

"صفوان! ذرا چیک کرو کوئی ڈیلکس روم خالی ہے یا۔" میری بات ادھوری ہی تھی کہ عماد نے زور سے "شش" کر کے مجھے چپ کروایا۔

"ہاں بھئی خرم! خاموش ہو جاؤ۔" صفوان نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "ومبلڈن اوپن لگا ہوا ہے اور دنیا کا فضول ترین کھلاڑی کھیل رہا ہے۔ بھئی خاموش ہو جاؤ۔"

"تمہیں ٹینس سے کوئی تکلیف ہے تو اپنے تک رکھو۔" عماد جو صفوان کے بار بار چینل بدلنے اور آواز ہلکی کرنے پر چڑا بیٹھا تھا، بول اٹھا۔

"شش! کوئی آ رہا ہے۔" میں نے دونوں کا ٹوکا تو وہ فوراً خاموش ہو گئے۔

وہ ایک فرنچ ٹورسٹ تھی جو غالباً گھومنے پھرنے کے لیے باہر جا رہی تھی۔ اس نے کمرے کی چابی میرے حوالے کی اور مسکراتے ہوئے باہر چلی گئی۔

"خرم! آج گھر آ جاؤ، ویسے بھی لاسٹ ویک جب تم آئے تھے تو ہم تو تھے ہی نہیں اور آج تو فریا کیک بنا رہی ہے۔" تھوڑی دیر بعد صفوان بولا۔

"کام ختم کر کے ہی آ سکوں گا نا!" میں نے جان چھڑانا چاہی، مگر وہ بضد تھا۔

"ہم نے تمہارے ہوٹل کی ڈیل کو سیلیبریٹ بھی نہیں کیا۔ چھوٹی سی پارٹی ہو جائے گی۔"

اس نے کچھ اس انداز سے دعوت دی کہ میں ٹھکرا نہ سکا۔

عماد کے گھر جا کر ہمیشہ ایسا لگتا تھا جیسے میں چڑیا گھر میں آ گیا ہوں۔ وہاں اتنے بچے تھے کہ خدا کی پناہ اور دو دفعہ کی ملاقات سے ہی وہ میرے فین بن چکے تھے۔

میرے ذہن میں فوراً ہی یہ خیال آیا تھا کہ ایک کیک اس "آدھے شہر" کے لیے کیسے پورا پڑے گا۔ لیکن جب شام کو اپنے سامنے رکھے "تھری ان ون" یعنی تین کیکس کو ایک دوسرے سے ملا کر رکھا دیکھا تو فریا کو داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

"خرم آپ کا ہوٹل کب تک بنے گا؟" فریا اپنے شیریں لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"ایک سال تک۔" میرے کہنے سے پہلے ہی عماد نے جواب دیا تھا۔ اس نے کچھ غصے سے بھائی کی طرف دیکھا۔

"تم سے کس نے پوچھا تھا؟"

"کسی نے نہیں ..... مگر جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میرے بولنے پر پابندی بھی نہیں لگائی تھی۔"

"جب تک آپ کا ہوٹل نہیں بنے گا، آپ کیا کریں گے؟" وہ دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔

"ڈاکے ڈالیں گے!" عماد نے پھر ٹانگ اڑائی۔ "بھئی ظاہر ہے کہ وینس برج پر ہی کام کریں گے! ویسے خرم! تمہارے ہوٹل کا سارا عملہ لڑکیوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔" عماد بہن کو نظر انداز کر کے میری طرف متوجہ ہوا۔

✻ ✻ ✻

ایک سال کیسے گزرا؟ مجھے یاد نہیں، البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ جس روز پاکستان نے ایٹمی دھماکے کیے تھے، اس سے ٹھیک ایک ہفتے بعد میرے ہوٹل "اسکائی ہائی" کا افتتاح تھا۔

ہوٹل کے افتتاح کے تین ماہ بعد ہی تمام کا تمام ہوٹل فل تھا اور اگلے دو ماہ کے لیے بک بھی۔ اس شرح آمدن سے میرا قرضہ کم عرصے میں اتر سکتا تھا۔ ہوٹل کی بکنگ دیکھتے ہوئے میں نے نرخ تین گنا بڑھا دیے۔ مجھے معلوم تھا لوگ ضرور آئیں گے۔ آخر ان کو ایک ہی جگہ پر بیک وقت گرینڈ پیانو، آتش دان اور سوانہ کہاں ملے گا؟ یہ صرف ابتدا تھی۔

اگلے دو برسوں میں بہت کچھ ہوا۔ فریا کی شادی ہو گئی اور وہ فرانس چلی گئی۔ میں نے لیڈز کے چاروں کونوں میں اپنے ہوٹل کھول لیے۔

گھر بھیجی جانے والی کثیر رقم سے جویریہ اور ماریہ کی شادی ہو گئی۔

اور میں اپنا بزنس مانچسٹر لے گیا۔

مانچسٹر میں کوئین الزبتھ روڈ پر ایک فلی ڈیکوریٹڈ پینٹ ہاؤس خریدنے کے بعد میں نے اپنی بہنوں اور اماں کو انگلینڈ بلوانے کا سوچا۔ مگر اس سے پہلے ہی اماں فوت ہو گئیں۔

میں اماں کے جنازے کو کندھا دینے پاکستان گیا اور سونیا مومنہ اور تجل کو لے کر مانچسٹر واپس آ گیا۔ یوں "جہانگیر پیلس" میں رہنے والی "پرنس" کے علاوہ پاکستان سے میرا ہر تعلق کٹ گیا۔



مانچسٹر آنے کے دو روز بعد ہی میں اپنے نئے ہوٹل کے لیے جگہ تلاش کرنے نکل پڑا۔

مانچسٹر میں اپنے نئے ہوٹل کے لیے مجھے ومزلو روڈ wimslow road پر ایک جگہ بہت پسند آئی۔ وہاں پر ایک خوب صورت سات منزلہ ہوٹل بن سکتا تھا۔ میں نے اسی وقت جا کر اس کے بروکر سے بات کی۔

"سوری سر! آپ لیٹ ہو گئے ہیں۔ اس جگہ کو خریدنے کا کوئی اور آپ سے پہلے کہہ چکا ہے۔" مجھے جواب ملا۔

وہ جگہ مجھے اتنی پسند آئی تھی، اور اب کوئی اور ادھر ہوٹل یا کچھ اور بنائے گا، یہ مجھے گوارا نہ تھا۔

"کون ہے وہ۔ جس نے یہ جگہ خریدنے کو کہا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"ایک ڈویلپر ہے، شیخ جہانگیر۔"

"کتنی قیمت لگائی تھی اس نے؟" میں نے پوچھا۔

"دو ملین پاؤنڈز۔" اس نے بے زاری سے جواب دیا۔

"میں تین ملین دوں گا۔ ابھی اور اسی وقت فائنل کرو۔" میں نے حتمی لہجے میں کہا۔

"یس سر!" اس نے پلکیں جھکائیں۔

مجھے شیخ جہانگیر کو ہرانے کی اتنی خوشی تھی کہ رات میں سونیا، مومنہ اور تجل کو باہر ڈنر پر لے گیا۔ woodlane's سے ڈنر کرنے کے بعد جب میں واپس آیا تو ایک کال میری منتظر تھی۔

"ہیلو!" میں نے قدرے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

"میں جہانگیر بات کر رہا ہوں اس دفعہ تو میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے، کیونکہ ابھی تم بچے ہو، نا سمجھ ہو، لیکن اگلی بار میرے راستے میں مت آنا۔ سمجھے؟" دوسری طرف سے دانت پیستے ہوئے لہجے میں کہا گیا تھا۔

"سمجھ گیا!" میں نے ہنستے ہوئے کہا تو دوسری جانب سے غصے میں فون کھٹاک سے رکھ دیا گیا۔ میں دل کھول کر ہنسا تھا۔



ایک بلڈنگ ڈویلپر کے ساتھ مل کر میں نے یہ نیا پروجیکٹ شروع کیا۔ اس پر قریباً" دس کروڑ پاؤنڈز کا خرچہ آنا تھا۔

مجھے رئیل اسٹیٹ کا کوئی تجربہ تھا نہ ہی مجھے ڈویلپر بننے کا کوئی شوق تھا۔ (آسان لفظوں میں ڈویلپر زوہ ہوتے ہیں جو خالی ہاتھ، دوسروں سے قرضہ مانگ کر بڑی بڑی عمارتیں بناتے ہیں، جو پانچ دس سال بعد ان کی ہو جاتی ہیں۔

بینک سے قرضہ لیتے وقت اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ عمارت کی تعمیر کی مدت صحیح طور پر تجویز کر کے ڈیڈ لائن رکھی جائے۔ جو ڈیڈ لائن بینک دیتا ہے، اس تک اگر عمارت نہ بنے تو ڈویلپر دیوالیہ ہو جاتا ہے۔

بینک سے ڈیڈ لائن 2002ء کے فروری تک کی تھی۔ ہمارے پاس کافی وقت تھا۔ پروجیکٹ بھی کافی مشکل تھا۔ خیر، اللہ اللہ کر کے کام کا آغاز ہوا۔ نقشہ ہر جگہ سے او کے ہونے کے بعد فائنل ہو گیا تو تعمیر کا کام شروع ہو گیا۔

اس دوران میں نے مانچسٹر میں دو ہوٹلز خرید لیے اور معمولی ردوبدل کے بعد انہیں بھی شروع کر دیا۔ میرا کاروبار بہت اچھا جا رہا تھا۔ یہ سب سمل کے لیے تھا۔

اسی سال، میں اپنی بہنوں کو گھمانے پھرانے لندن لے آیا۔

جہاں لندن کا نام آ جائے، وہاں تھیٹر، میوزک کنسرٹس اور آرٹ کا خیال خود بخود ذہن میں ابھرتا ہے۔ اس معاملے میں یہ شہر ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔

مجھے سب سے زیادہ اولڈ بک اسٹورز پسند آئے۔ میں پورا پورا دن Hatchard's اور Foyle پر کھڑا کتابیں خریدتا رہا۔ Harrods، فورٹنم اینڈ میسن اور مارکس اینڈ اسپنسر سے شاپنگ کرنے کے علاوہ میری بہنوں کو لندن میں کوئی خاص دلچسپ چیز نظر نہیں آئی۔

لندن میں اتوار کو دریائے ٹیمز کے کنارے کھلی فضا میں پینٹنگز کی نمائش ہوتی ہے۔ وہاں پر درجنوں مصور

اپنی تصاویر کے ساتھ آئے ہوئے تھے۔ ان سب میں ایک قدر مشترک تھی۔ وہ ناکام آرٹسٹ تھے جن کی بوگس تصاویر کو کسی گیلری میں جگہ نہ مل سکی تھی۔ ترس کھا کر میں نے ایک تصویر خریدلی۔

"بھائی آپ اسے کہاں لگائیں گے۔" ...... نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

"کسی کو بھیجنی ہے۔" میں نے زیرلب مسکراتے ہوئے کہا۔

اگلے روز میں نے وہ پینٹنگ شیخ جہانگیر کو بھجوادی۔

وہ ایک ابر آلود شام تھی۔

"سوائے" کی اسپیشل سنڈے ٹی پینے کے بعد مومنہ اور سونیا کو میں نے chadwick's پر چھوڑا، جبکہ خود تجل کے ساتھ ونڈسر کا قلعہ دیکھنے چلا گیا۔ اس کے بعد ہم ہیمپٹن کورٹ اور کنٹربری گئے۔ کنٹربری کا کیتھیڈرل دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

تجل گھوم پھر کر پوری جگہ دیکھ رہی تھی، جبکہ میں ایک جگہ بیٹھ کر لطف اندوز ہو رہا تھا۔ دور ایک کونے میں سر گھٹنوں میں دیے ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کے لمبے سیاہ بال شانوں سے نیچے آ رہے تھے۔ خوامخواہ ہی مجھے اس سے ہمدردی سی محسوس ہونے لگی۔

"پتہ نہیں اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہو گا جو وہ یوں بیٹھی ہے۔" میں نے آزردگی سے سوچا۔

کچھ دیر بعد اس لڑکی نے سر اٹھایا۔

میں اسے دیکھ کر مبہوت سا رہ گیا۔

عام سی بلیو جینز کے اوپر سیاہ شرٹ پہنے، بنا کسی میک اپ کے اس بہت حسین لڑکی کو ساڑھے تین برس بعد میں نے دیکھا تھا۔

وہ ماہ نور جہانگیر تھی۔

اس کو دیکھ کر مجھے وہ ڈیڑھ مہینہ یاد آگیا جب میں اور سمل باقاعدگی سے ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ اس لمحے مجھے بیتے دن بہت یاد آئے۔ سمل کی یاد کبھی میرے دل سے محو نہیں ہوئی تھی۔

میری ہر بے سکون اور بے چین رات میں وہ میرے ساتھ تھی، میرے ہر مصروف دن میں وہ میرے ہمراہ تھی۔ اور میں اسے بھول بھی کیسے سکتا تھا۔

اس لمحے ماہ نور جہانگیر کو دیکھ کر میرے اندر سمل کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ وہ کہاں ہو گی، کیسی ہو گی؟ کیا وہ بھی مجھے یاد کرتی ہو گی؟

بے اختیار ہی میں اٹھا اور ماہ نور کی جانب بڑھ گیا۔ ماہ نور کو دیکھ کر مجھے ایک دم شاک لگا تھا۔ وہ کافی بدلی بدلی لگ رہی تھی۔ اس کے بال اب کافی لمبے اور بغیر کسی ڈائی کے تھے۔ اس کے کپڑے بہت عام تھے۔ وہ لڑکی جو گوچی اور ورساچی سے کم کچھ نہیں پہنتی تھی، شنیل کے پرفیوم لگاتی تھی، Briony's (لندن) سے بال کٹواتی تھی، امپورٹڈ کاسمیٹکس استعمال کرتی تھی، وہ اب اتنی الجھی الجھی اور مضمحل کیوں لگ رہی تھی؟

"ماہ نور!" اس کے قریب جا کر میں نے اسے پکارا۔

وہ بری طرح چونکی۔ "آ آپ؟"

"ہاں میں! خرم۔" میں اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ وہاں شور بہت تھا، بمشکل ہی آواز سنائی دے رہی تھی۔

"آپ ادھر کیا کر رہے ہیں؟" وہ حیرت سے بولی۔

"میں ادھر ہی ہوتا ہوں!"

"لندن میں؟"

"نہیں۔ مانچسٹر میں۔"

"کیسے ہیں آپ؟" وہ پوچھنے لگی۔

"میں ٹھیک ہوں۔ سمل کیسی ہے؟" میں نے بے قراری سے پوچھا۔

"جی؟" وہ بہت حیران ہوئی تھی۔

"سمل کیسی ہے؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔ اب وہ مجھے الجھن بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

"آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ سمل کیسی ہے؟"

"ہاں!" میں نے متذبذب نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "تم اس کی بہن ہو، اس کے ساتھ رہتی ہو! تم ہی سے پوچھوں گا۔"

"آپ کو..... آپ کو کچھ نہیں پتہ؟" وہ انگلیاں مسلنے لگی۔

"کیا نہیں پتہ؟" میں پریشانی سے پوچھنے لگا۔ یکبارگی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔

"آپ سمل سے آخری بار کب ملے تھے؟"

"جب اس نے مجھے گھر بلایا تھا۔ 17 مارچ تھی۔" میں اچنبھے سے بولا۔

"اوہ!" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ "یعنی آپ کو کچھ نہیں پتا۔"

"نہیں..... پلیز بتاؤ نا، کیا ہوا سمل کو؟" میرا دل ہول رہا تھا۔

"نہیں کیوں ہول رہا تھا۔

"آپ، آپ اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ وہ بہت دل برداشتہ تھی۔ اس سے آپ کی بے وفائی برداشت نہ ہو سکی اور....." ماہ نور اب آنسو روکنے کے لیے نچلا لب کاٹ رہی تھی۔

"کیا کیا اس نے؟ بتاؤ نا نور؟" میں چیخ پڑا، مگر میری چیخ کیتھیڈرل کی دیواروں میں ہی گم ہو کر رہ گئی۔

"آپ کے جانے کے فوراً بعد۔" اس کی آواز رندھ گئی تھی۔ "سمل نے..... سمل نے خودکشی کرلی۔ اس کو مرے ہوئے تین سال سے اوپر ہو گیا ہے۔ اس کو ہم سب نے بہت دکھ دیے تھے۔ میں نے بہت برا کیا تھا اس کے ساتھ، اور، اور آپ نے بھی بہت برا کیا تھا۔ آپ اس کو چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ساری زندگی اس کے ساتھ زیادتی ہوتی رہی۔ اب وہ اور کیا کرتی۔ ڈیڈیا مما نے کبھی اس کو بیٹی نہ سمجھا تھا۔ حالانکہ وہی اچھی بیٹی تھی۔"

ماہ نور اب سسکیاں لے کر رو رہی تھی۔

مجھے ایسا لگا کہ جیسے کیتھڈرل کی دیواریں میرے اردگرد تنگ ہو رہی ہوں۔ فضا سے آکسیجن ایک دم ہی ختم ہو گئی تھی۔ میرا دم گھٹ رہا تھا۔ چھت زمین کے قریب آ رہی تھی۔ مجھے شدید گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ میں نے سر دیوار کے ساتھ لگا دیا اور آنکھیں موند لیں۔

جس ایک شخص کے لیے آپ کئی برس محنت کرو، اور وہ ہی نہ رہے تو کیسا لگتا ہے۔ میں تو ستاروں سے بھی آگے جانا چاہتا تھا۔ مگر کس کے لیے؟

اس کے لیے جو مر چکی ہے؟ جو اس دنیا میں ہے ہی نہیں، جو میری ہی وجہ سے حرام موت مرنے پر مجبور ہو گئی؟ مگر سمل تو ایسی نہ تھی۔ وہ کیسے مر سکتی ہے؟ وہ کیسے مجھے چھوڑ کر جا سکتی ہے؟

تو کیا تم واقعی چلی گئیں سمل؟ مجھ سے روٹھ کر، منہ موڑ کر، تم اس دنیا سے چلی گئیں۔ کیا تم اتنی سخت ناراض ہو گئی تھیں کہ سب سے ناتا توڑ کر چلی جاؤ۔ مجھے چھوڑ دو؟ مگر میں تو تمہارا واحد دوست تھا۔ تمہاری طرح اکیلا تھا، بچپن سے محروم تھا۔ ہم دونوں تو ایک جیسے تھے۔ میں تو تمہارا سب کچھ تھا! اور تم، تم مجھ ہی سے ناراض ہو گئیں؟ تمہیں میرا ہی اعتبار نہ رہا تم مجھے لالچی سمجھتی رہیں؟ کیوں سمل؟ کیوں؟

اگر میں لالچی ہوتا تو تمہارے بجائے ماہ نور سے محبت کا ڈھونگ رچاتا۔ اگر میں حسن پرست ہوتا، تو تمہارے بجائے ماہ نور کو پسند کرتا، مگر میں تو تمہارا طالب تھا سمل! تمہیں ہی چاہتا تھا۔ تم خود کو بہت بدصورت سمجھتی تھیں، تم نے کبھی اپنے آپ کو میری آنکھ سے نہیں دیکھا تھا۔ اگر دیکھ پاتیں، تو تم تو دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی تھیں۔

کاش میں تمہیں اپنے جانے کی وضاحت دے کر جاتا۔ مگر سمل میں لفظوں سے نہیں عمل سے اظہار کرنا چاہتا تھا۔

تمہارے باپ کی نظروں میں سرخرو ہونا چاہتا تھا تاکہ وہ بخوشی تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھمادیں۔ مجھے شیخ جہانگیر کی دولت سے کوئی غرض نہ تھی، میں تو تم سے محبت کرتا تھا۔ سچی محبت! صرف تم سے، سمل جہانگیر۔

مجھے جب بھی کوئی کامیابی نصیب ہوئی، مجھے تم یاد آئیں۔ اپنی ہر خوشی پر مجھے اپنے اردگرد تمہاری موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔ فضا میں تمہاری خوشبو محسوس ہوتی تھی۔ تاریک رات میں تمہاری محبت کے جگنو دکھائی دیتے تھے۔ مگر تم تو تھیں ہی نہیں۔

تو کیا میں سراب کے پیچھے بھاگ رہا تھا؟ اس اندھی سڑک پر کسی بے منزل مسافت کا مسافر تھا؟ صحرا میں سورج کی تپش کو آب حیات سمجھ کر اس کی جانب دوڑ رہا تھا؟ پچھلے ساڑھے تین برس تک خود کو تھکا دینے والی ذہنی اور جسمانی اذیت اپنے آپ کو اس مقصد کے حصول کے لیے دے رہا تھا جو درحقیقت، اسی لمحے، اسی پل ختم ہو گیا تھا، جب میں تمہارے گھر سے لوٹا تھا۔ تم مر گئیں تم نے میری اس بے وفائی کو دل سے لگا کر موت قبول کرلی جو میں نے کی ہی نہیں تھی۔ تم نے میرے انکار کو لالچ سمجھا تم میری وجہ سے مر گئیں سمل!

میں تو اس راہ پر تمہارے خواب کی تعبیر ڈھونڈنے نکلا تھا، مگر اپنی محبت کے جگنو ہی کھو بیٹھا۔

ماہ نور کی سسکیوں کی آواز کہیں دور ـــــ سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سر اٹھا کر سرخ ہوتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

ماہ نور کے بارے میں سمل نے مجھے بتایا تھا کہ وہ بہت بہادر ہے، بڑی سے بڑی بات بھی ہو جائے، وہ نہیں روتی۔ لیکن اس وقت وہی ماہ نور بلک بلک کر بچوں کی طرح رو رہی

تھی۔ سمل کو مرے ہوئے ساڑھے تین برس ہو گئے تھے مگر اس کے انداز سے لگتا تھا کہ جیسے وہ آج مری ہو۔

"تم یہاں کیا کر رہی تھیں؟" میری آواز رندھی ہوئی تھی۔

"میں، میں بہت ڈپریسڈ تھی۔ اس لیے ادھر آ گئی۔" وہ آنسو صاف کرتے ہوئے بولی۔ "آپ پاکستان سے یہاں کب آئے؟"

"97ء کے مئی میں۔"

"اس کے بعد واپس نہیں گئے؟"

"نہیں۔" میں نے دھیرے سے سر ہلا دیا۔ اس وقت تفصیلات بتانا میرے بس میں نہ تھا۔

"باہر چلیں؟" وہ اٹھتے ہوئے بولی میں نے اس کے خوب صورت چہرے کی طرف دیکھا۔ اب وہ ہتھیلیوں کی پشت سے آنکھیں صاف کر رہی تھی، میں اٹھ کھڑا ہوا۔

ہم دونوں اکٹھے باہر آ گئے۔ ماہ نور نے ایک لمحے کو پیچھے کیتھیڈرل کی پتھروں سے گھری عمارت پر الوداعی نگاہ ڈالی اور پھر تیز تیز قدموں کے ساتھ لش گرین گھاس پر چلنے لگی۔ وہ تیز چل رہی تھی۔ میں پیچھے رہ گیا تھا۔ تھوڑی دور جا کر وہ رک گئی اور مڑ کر میری طرف دیکھا۔

"میری بہن اندر ہے۔ تم جاؤ، میں بعد میں جاؤں گا۔" میری آواز بہت دھیمی تھی۔ پتہ نہیں وہ سمجھی بھی تھی یا نہیں، اس نے اثبات میں سر ہلا دیا اور پارکنگ ایریا کی طرف بڑھ گئی۔

"بھائی!" تجل شاید پیچھے سے مجھے پکار رہی تھی۔ مجھ سے سر نہیں موڑا گیا۔ اس وقت مجھ سے کچھ بھی نہیں ہو رہا تھا۔ میرا دماغ بری طرح ماؤف ہو گیا تھا۔

"بھائی۔" وہ اب میرے قریب آ گئی۔ "میں آپ کو اندر ڈھونڈ رہی تھی۔ چلیں؟" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی، مگر میں سن نہ سکا۔

پارکنگ ایریا کی طرف جاتے ہوئے میری نگاہ فٹ پاتھ پر تصویر بناتے ایک بوڑھے فٹ پاتھ آرٹسٹ پر پڑی۔ وہ کافی انہماک سے مختلف رنگوں کو زمین پر بھر رہا تھا۔

اچانک ہی بارش شروع ہو گئی۔ آسمان سے گرتی پانی کی بوندوں نے اس کی تصویر کو بھی نہیں بخشا۔ وہ معمر آدمی بے چارگی سے ایک طرف کھڑا اپنی کئی گھنٹوں کی محنت سے بنی تصویر کو مٹتے دیکھنے لگا۔ فٹ پاتھ پر موجود دلفریب رنگوں کو بارش کے پانی نے صاف کر کے زمین کی خوب صورتی ختم کر دی تھی۔

جس طرح میری زندگی سے رنگ اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے تھے۔

☆ ☆ ☆

پہلے وہ سب کچھ سمل کے لیے تھا۔ اب وہ میری بہنوں کے لیے تھا۔ میرے اپنے لیے نہ پہلے کچھ تھا، اور نہ اب کچھ۔

ایک مشین بن کر میں نے اپنی تمام توانائیاں اپنے بزنس کے لیے وقف کر دیں۔ ماہ نور نے کہا تھا، سمل مری ہے۔ وہ مری نہیں تھی۔ وہ اب بھی زندہ تھی میری یادوں میں، میرے خیالوں، میری سوچوں اور خوابوں میں

دنیا نئی صدی میں داخل ہونے کے قریب آ رہی تھی

اور میری منزل قریب آ رہی تھی۔

بارہ سال کی عمر میں ہوٹلز کی چین بنانے کا دیکھا گیا خواب اب خواب نہیں رہا تھا۔ خواب تو وہ ہوتے ہیں جن سے خوشی اور امیدیں وابستہ ہوتی ہیں خواب جاگتی آنکھوں سے دیکھی گئی ان خوشیوں کا نام ہے جو حقیقت میں نہیں ہوتیں۔ خواب تو امید ہوتے ہیں 'اچھے وقت کی، اچھے مستقبل کی، اچھی زندگی کی' خواب محبت سے عبارت ہوتے ہیں۔ میری محبت مجھ سے دور چلی گئی تھی، سو میرا خواب، خواب نہیں ڈیوٹی بن کر رہ گیا تھا۔ مجھے اب اپنی بہنوں کے لیے یہ ڈیوٹی پوری کرنی تھی۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، مانچسٹر میں میرے سیون اسٹار ہوٹل کی تکمیل کا لمحہ قریب آ رہا تھا۔ یہ جگہ میں نے شیخ جہانگیر کے ہاتھوں سے چھینی تھی۔ شیخ جہانگیر، جنہیں رئیل اسٹیٹ کا جائنٹ کہتے تھے۔ اس جگہ وہ کوئی شاپنگ پلازہ تعمیر کرانا چاہتے تھے۔ اب جب میرا ہوٹل بنے گا تو ان کے دل پر کیا گزرے گی، یہ سوچ کر ہی مجھے بہت خوشی محسوس ہوتی تھی۔

اس روز میرے پارٹنر نے مجھے فون کر کے سائٹ پر بلایا۔ وہ کسی گڑبڑ کا کہہ رہا تھا۔ میرے پہنچنے پر اس نے مجھے اشارتاً خاموش رہنے کا کہا۔ وہ شاید ٹھیکیدار کے سامنے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب وہ چلا گیا تو اس نے ہوٹل کی نامکمل عمارت کے سامنے کھڑے ٹرکوں کی طرف اشارہ کیا اور کہنے لگا۔

"ہم نے جن شیشوں کا آرڈر دیا تھا، وہ آج آ گئے ہیں۔"

"تو مسئلہ کیا ہے؟"

"ہم نے ٹنٹڈ گلاس Tinted glass کا آرڈر دیا تھا۔ لیکن جو شیشہ ہمیں ملا ہے، اس کا Tint بھی نامناسب ہے اور کٹاؤ بھی غلط ہے۔ یہ ہماری بلڈنگ کی کھڑکیوں پر پورا نہیں آئے گا۔"

"اس سے ہوٹل کی کنسٹرکشن پر کتنا اثر پڑے گا؟"

"اگر ایک ہفتے تک شیشہ مل جائے تو ٹھیک ہے، ورنہ بہت مشکل ہو جائے گی۔"

"تم نے یہ معاملہ ٹھیکے دار سے ڈسکس کیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، میں سب سے پہلے تمہیں بتانا چاہتا تھا۔"

"فی الحال تم کسی کو بھی نہ بتاؤ، مزدوروں سے کہو اس شیشے کو ہاتھ بھی نہ لگائیں۔ میں اس کا حل سوچتا ہوں۔ شاید آرڈر غلط لکھا گیا تھا۔" میری بات سن کر اس نے سر نفی میں ہلا دیا۔

"میرا نہیں خیال خرم! کہ آرڈر غلط لکھا گیا ہے۔"

"پھر؟"

"میرا خیال ہے کسی نے آرڈر غلط لکھوا کر دشمنی نکالی ہے۔"

"مگر میری کسی کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے۔"

"کچھ competitors ایسے کرتے ہیں۔"

"اچھا، میں اس گلاس کمپنی کو دوبارہ آرڈر....."

"کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہم نے یہ شیشے چھ ماہ پہلے آرڈر کیے تھے۔ اگر تم ابھی آرڈر کر بھی دو، تو تین ماہ سے زیادہ کے عرصے میں ہمیں ہمارا مطلوبہ آرڈر ملے گا۔"

"تو؟"

"تو یہ میرے بھائی کہ بینک سے ڈیڈ لائن اگلے سال کی 31 جنوری تک ہے۔ آج 16 ستمبر ہے۔ اگر 16 دسمبر کو ہمیں شیشہ ملے تو ہم اسے لگائیں گے کب؟"

"میں، میں کچھ کرتا ہوں۔" میں جانے کے لیے مڑا۔

"خرم!" اس کی آواز پر میں نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"خرم اگر ایک ہفتے تک ہمیں شیشے نہ ملے تو ہم دیوالیہ ہو جائیں گے۔ یہ دس کروڑ پاؤنڈز کا پروجیکٹ ہے۔"

میں تاسف سے سر ہلاتے ہوئے گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

☆ ☆ ☆

اگر ایک ہفتے تک شیشے نہ ملے تو.....؟ یہ سوال میرے ذہن میں پچھلے آدھے گھنٹے سے گردش کر رہا تھا۔ میں نے بالآخر ٹھیکیدار کا نمبر ملایا۔

"فوسٹر! ہم نے شیشے کس گلاس کمپنی سے خریدے ہیں؟" بغیر سلام دعا کے میں نے پوچھا۔

"اینلا ٹنک پینل اینڈ گلاس کمپنی۔"

"پتہ کرو، یہ کس کی ہے؟" اتنا کہہ کر میں نے فون رکھ دیا۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے تیزی سے لپک کر اسے اٹھا لیا۔

"سر! وہ کمپنی تین برس پہلے ایس جے انٹرپرائزز نے خریدی ہے۔"

"اور ایس جے انٹرپرائزز کس کی ہے؟"

"سر، ایس جے انٹرپرائزز شیخ جہانگیر کی ہے۔"

میں نے فون رکھ دیا۔

لندن انکوائری سے شیخ جہانگیر کے لندن آفس کا نمبر لے کر ڈائل کیا تو وہ وہاں نہیں تھے۔ وہ دبئی اپنے ہیڈ آفس میں تھے۔

تقریباً بیس منٹ بعد میرا ان سے دبئی میں رابطہ ہو گیا۔ ڈیڑھ منٹ کے تکلیف دہ انتظار کے بعد ان کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"جہانگیر اسپیکنگ!"

"میں خرم بات کر رہا ہوں۔ خرم زید۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"کون خرم زید؟" وہ مصروف لہجے میں بولے۔

"وہی خرم زید جس نے مانچسٹر میں ونسلو روڈ والی زمین آپ کے ہاتھوں سے چھینی تھی۔" دوسری جانب چند ساعتوں کی خاموشی چھائی رہی۔ پھر ان کی آواز ریسیور میں ابھری۔

"ہوں..... پھر؟"

"پھر یہ مسٹر جہانگیر! کہ بزنس میں رقابت چلتی ہے، مگر دھوکا نہیں۔" میں نے ایک ایک لفظ چبا چبا کر کہا۔

"میں نے کسی کے ساتھ دھوکا نہیں کیا زید!" وہ آرام سے بولے "تمہیں وہ زمین چاہیے تھی سو مل گئی، میں تو اس بات کو بھول بھی چکا تھا۔"

"اینلا منک بینل اینڈ گلاس کمپنی آپ کی ہے؟"
"آں.....ہاں کیوں؟" ان کا لہجہ اب الارمنگ تھا۔
"آپ اس کو دھوکا نہیں سمجھتے مگر میرے نزدیک غلط مال سپلائی کرنا دھوکا ہے۔" اتنا کہہ کر میں نے کھٹاک سے فون رکھ دیا۔
غصّے سے میرا برا حال تھا۔ مقابلہ اپنی جگہ، مگر کسی کو بالکل تباہ کر دینا کہاں کی انسانیت ہے؟
آج سے ٹھیک دس برس پہلے، جب شیخ جہانگیر کی بیٹی ماہ نور جہانگیر نے مجھے تباہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے مجھے اس نوکری سے دھکے دے کر نکلوایا تھا جس کی مجھے اشد ضرورت تھی اور آج، آج اس کے باپ نے بھی میرے ساتھ ویسا ہی کیا تھا۔
کچھ دیر بعد میں ٹھیکے دار فوسٹر سے فون پر بات کر رہا تھا۔
"تم کنسٹرکشن سائٹ پر گئے؟" میں نے پوچھا۔
"نو سر!"
"کام ہو رہا ہے؟"
"یس سر!"
"ایسا کرو، مزدوروں سے کہو ابھی شیشوں کو ہاتھ نہ لگائیں۔"
"سر، یہ آڈر مسٹر ولس پہلے ہی دے چکے ہیں۔" اس نے میرے پارٹنر کا نام لیا۔
"اور کچھ کہا مسٹر ولس نے؟"
"نو سر!" وہ رکا اور قدرے توقف سے بولا۔ "اگر ہم ان ہی شیشوں کو استعمال کر لیں تو.....؟"
میں کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا "شاید یہ نہ ہو سکے۔"
"اتنا تو مجھے بھی اندازہ ہے۔ ان کا کٹ اور tint دونوں غلط ہیں۔"
"میرے پاس ایک حل ہے، تم سائٹ پر پہنچو، میں بتاتا ہوں۔" اتنا کہہ کر میں نے فون رکھ دیا اور آفس سے نکل آیا۔
جاتے وقت البتہ میں اپنی سیکرٹری کو دبئی کے لیے سیٹ بک کروانے کا کہنا نہیں بھولا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ میرے سائٹ پر پہنچنے کے دس منٹ بعد ہی وہاں آ گیا۔
"پھر سر! کیا حل ہے آپ کے پاس؟" وہ پوچھنے لگا۔
"تم نے شیشے دیکھے ہیں؟" میں نے الٹا اس سے سوال کیا۔
"نہیں سر، ابھی تو موقع نہیں ملا۔"
"موقع ملے گا بھی نہیں۔"
"کیوں سر؟"
"بی کوز یو آر فائرڈ۔" (کیونکہ میں نے تمہیں فارغ کر دیا ہے)
"جی؟" وہ حیران سا ہو کر مجھے دیکھنے لگا۔
تقریباً ایک سال پہلے اس کی لاپروائی سے بلڈنگ میں آگ لگتے لگتے بچی تھی۔ اس بات پر میں نے اسے تھپڑ دے مارا تھا اور بہت بے عزتی بھی کی تھی۔ اس بے عزتی کا بدلہ اس نے اپنے بھائی رابن فوسٹر، جو اینلا منک بینل اینڈ گلاس کمپنی کا منیجر تھا، کی مدد سے مجھ سے لیا تھا۔
میں نے ولس کو منع کیا تھا کہ وہ کسی کو کچھ نہ بتائے۔ فوسٹر کہہ رہا تھا اسے ولس نے کچھ نہیں بتایا، پھر اس کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ شیشوں کا tint اور cut غلط ہے؟ ظاہر ہے، اس نے غلط شیشے آرڈر کیے تھے یا پھر آرڈر بعد میں تبدیل کروا دیا تھا۔
میں نے اسے پولیس کے حوالے کر دیا مگر اس طرح نقصان پورا نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے جتنی بھی گلاس کمپنیز کو فون کیا، شیشوں کی ڈلیوری کی مدت کم از کم بھی دو ماہ سے کم نہ تھی۔
دو روز بعد کی میری دبئی کی فلائٹ تھی۔ مجھے شیخ جہانگیر سے اپنے رویے کی معافی مانگنا تھی۔
دبئی جانے سے ایک روز پہلے ہی شیخ جہانگیر نے مجھے میرے مطلوبہ شیشے بھجوا دیے۔ اس روز کے بعد ہی میں نے رئیل اسٹیٹ سے توبہ کر لی۔

☼ ☼ ☼

ایس جے انٹرپرائزز کا ہیڈ آفس دبئی میں بائی پاس روڈ پر واقع تھا۔ نیلے شیڈز کے شیشوں سے اس بیس منزلہ عمارت کا بیرونی حصہ ڈھکا ہوا تھا۔ شیخ جہانگیر کا اپنا آفس ٹاپ فلور پر تھا۔
ان کی سیکرٹری نے مجھے بغیر ایک لمحے کے توقف کے اندر بھیج دیا۔ وہ میری آمد سے باخبر تھے۔
ہلکی سی دستک دے کر میں نے دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو گیا۔ ان کا آفس بہت وسیع اور لیوشلی ڈیکوریٹڈ

تھا۔ گرے اور اسٹیل کلر کی تھیم میں پورا کمرہ ڈیزائن کیا گیا تھا۔ آفس چیئرز' صوفہ سیٹ' پردے' کارپٹ اور وال پیپر سب کچھ نہایت نفاست سے انھی رنگوں سے سجایا گیا تھا۔ ان کے ٹیسٹ کا اندازہ میں دیواروں پر لگی پینٹنگز سے کر سکتا تھا۔

غالباً" ان کو فلیمش پینٹرز بہت پسند تھے۔ کیونکہ زیادہ تر فلیمش آرٹ ہی کمرے کی دیواروں کی زینت بنا ہوا تھا۔ بالکل ساتھ ایک کافی چیپ سی پینٹنگ لگی تھی۔ اتنی خوب صورت کولیکشن کے ساتھ ایک فضول پینٹنگ لگانے کا مقصد مجھے سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

یہ میری ان سے پہلی ملاقات تھی۔ اس سے پہلے ان کو اخبارات میں ہی دیکھا تھا۔ کبھی کسی پروجیکٹ کا افتتاح کرتے ہوئے' کبھی کسی کنگ کے ساتھ کبھی کسی پریزیڈنٹ کے ساتھ ڈنر کے موقع پر' کسی سیمینار سے خطاب کرتے ہوئے شیخ جہانگیر ملٹی ڈائمینشنل پرسنالٹی کے مالک تھے۔

رسائل و اخبارات میں وہ اتنے ہینڈسم اور گریس فل نظر نہیں آتے تھے' جتنے حقیقت میں تھے۔ سیاہ رنگ کے تھری پیس سوٹ میں ان کی شخصیت اور بھی زیادہ پرکشش لگ رہی تھی۔

مجھے دیکھ کر ایک نرم سی مسکراہٹ نے ان کے لبوں کا احاطہ کر لیا۔ وہ اپنی نشست سے اٹھے اور کافی گرمجوشی سے میرے ساتھ مصافحہ کیا۔

"کیسے ہو ینگ مین؟"

"فائن سر!" میں بیٹھتے ہوئے بولا۔ ان کی آنکھیں بالکل سمل جیسی تھیں۔ گہری اور سیاہ' جبکہ باقی نقوش ماہ نور والے تھے۔ خوب صورت اور دلکش۔

مجھے اپنے رویّے پر شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ خوامخواہ ہی میں نے ان سے اتنی بدتمیزی سے بات کی' ان کو مورد الزام ٹھہرایا' جبکہ انہوں نے کمال مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایک دن بعد ہی میرے مطلوبہ شیشے بھجوا دیے۔ پتہ نہیں انہوں نے اتنے زیادہ شیشوں کا انتظام ایک ہی دن میں کیسے کیا ہو گا؟

"کیا پیو گے؟ چائے' کافی یا ٹھنڈا؟" وہ بہت دوستانہ انداز میں پوچھنے لگے۔

"بلیک کافی' چینی کے بغیر۔" انہوں نے میرے جواب پر ریسیور اٹھایا اور دو بغیر چینی کے بلیک کافی کا آرڈر دیا۔

"تو مسٹر زید! میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

انہوں نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے کہا۔

"سر! میں بہت شرمندہ ہوں۔ آپ سے اپنے رویّے کی معافی مانگنے آیا ہوں۔" میں خفیف سے لہجے میں بولا۔

"معافی مانگنے آئے ہو۔ مگر ابھی تک مانگی تو نہیں۔" ایک لمحے کو رک کر انہوں نے میرے چہرے کے تاثرات دیکھے پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ "جسٹ کڈنگ۔"

اتنے میں کافی آگئی۔

ملازم کے جانے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوئے۔

"جس طرح تم نے مجھ سے بات کی' کوئی اور کرے تو میں منہ توڑ دیتا ہوں لیکن۔" وہ مسکرائے۔ "تم اپنے شہر کے ہو' اس لیے بچ گئے۔"

ان کو معلوم تھا کہ میرا تعلق اسلام آباد سے ہے۔

"غلطی تمہاری نہیں تھی۔" وہ کہہ رہے تھے۔ "تمہارے کنٹریکٹر نے ہی گڑبڑ کی تھی۔ اس کے بھائی نے اوریجنل آرڈر کو چینج کر دیا تھا۔ لیکن میں نے پھر بھی شیشے بھجوا دیے' تاکہ تمہیں کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا پڑے۔"

"آپ چاہتے تو نہ بھی بھجواتے' پھر بھی آپ نے بھجوا دیے' کیوں؟"

"میں نے کہا نا زید! تم اپنے شہر کے ہو۔"

"اٹس خرم!" میں نے اپنا پہلا نام لینے پر زور دیا۔

"رائٹ' خرم..... اس کا مطلب ہوتا ہے۔ ہیپی مین لیکن تم تو شکل سے....." وہ کہتے کہتے رک گئے۔

"میں شکل سے کیا؟"

"ڈیوڈ بیکھم لگتے ہو۔"

"آپ نے بیان بدلا ہے۔"

"اوکے! میں کہہ رہا تھا' مغرور لگتے ہو۔"

میں ہنس پڑا۔ "مجھے پتہ تھا۔"

"ویسے بیکھم بھی لگتے ہو۔"

"میں اس سے بہتر ہوں۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"شکل میں؟" انہوں نے ابرو اچکائی۔

"شکل میں بھی اور گیم میں بھی۔"

"یو آر اے فٹ بالر؟" وہ حیران ہوئے تھے اور متاثر بھی۔ "ریئل میڈرڈ کے لیے کھیلتے ہو؟"

"نہیں' ہیڈنگلے کے لیے۔ کبھی کبھی وہ بلا لیں تو کھیلتا ہوں' ورنہ کام ہی اتنا ہوتا ہے کہ....." میں نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"پتہ ہے تم کیا ہو؟" میرا چہرہ بغور دیکھتے ہوئے وہ دھیرے سے بولے۔

"آپ بتائیں!"

"ہینڈسم' مغرور' ایمبیشس' روڈ اور فٹ بالر۔"

"اور آپ کا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"میں بس فٹ بالر نہیں ہوں۔" وہ ہنستے ہوئے کہنے لگے اور وہ صحیح کہہ رہے تھے۔

میری طرح وہ بھی صاف گو' ڈیشنگ اور سیلف میڈ انسان تھے۔

ان کی ناک بھی میری طرح کھڑی تھی' جس کی وجہ سے وہ مغرور دکھتے تھے۔ ان کے چہرے پر ایک بے ساختہ پن تھا جو سمل کے چہرے پر میں نے دیکھا تھا۔ چال ڈھال اور ہر انداز و اطوار سے ان میں وقار جھلکتا تھا۔ یہ خصوصیت سمل میں تھی' مگر اس کے انداز میں عجز کا عنصر بھی تھا' جبکہ شیخ جہانگیر کے ساتھ ایسا نہ تھا۔ بالکل میری طرح۔

خفت مٹانے کے لیے میں ادھر ادھر دیکھنے لگا' نگاہیں بے اختیار ہی اس نامناسب پینٹنگ پر مرکوز ہو گئیں جو شیخ جہانگیر جیسے آرٹ لور کے کمرے میں لگی تھی۔

"پینٹنگ دیکھ رہے ہو؟ پسند آئی' یہ بیچ والی؟"

"سچ پوچھیں تو نہیں۔" میں فوراً" بولا۔

"ایک دوست نے تحفے میں دی تھی۔" وہ پیپر ویٹ گھماتے ہوئے بولے۔ "دراصل مانچسٹر میں' میں نے ایک جگہ دیکھی تھی' ڈیل بھی تقریباً" مکمل ہو گئی تھی' مگر پھر معلوم ہوا کہ ایک لڑکا لے اڑا ہے۔ اسی نے بھجوائی تھی۔"

مجھے سخت احساس شرمندگی نے آن گھیرا۔ وہ تصویر میں نے ہی ان کو' لندن سے ٹیمز کے کنارے ایک ناکام آرٹسٹ سے خرید کر بھیجی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا وہ اسے آفس میں لگا لیں گے۔ تھوڑا سا جھینپ کر میں نے انہیں دیکھا۔

"اٹس اوکے ینگ مین!" وہ رسانیت سے بولے۔ "پاکستان گئے ہو کبھی؟"

"میں برٹش نیشنل ہوں' برٹش بورن نہیں۔ زندگی کے 23 سال پاکستان میں گزارے ہیں۔ پانچ برس پہلے لیڈز آیا تھا۔"

"کوئی رشتہ دار ہے لیڈز میں؟"

"رشتہ دار تو نہیں' مگر ایک صاحب ہیں' بلال احمد' ان کی فیملی سے اچھے تعلقات ہیں۔"

"وہ کیا کرتے ہیں؟"

"ہوٹیلئر بھی ہیں اور پراپرٹی کے بزنس میں بھی ہیں۔" میں بتانے لگا "لیڈز اور بریڈ فورڈ میں ان کے ہوٹلز ہیں۔ ایک ہوٹل دبئی میں بھی ہے۔"

"دبئی میں؟ کیا نام ہے؟"

"تال ٹریز۔"

"تم عماد کے انکل کی بات کر رہے ہو؟"

"آپ جانتے ہیں عماد کو؟" میں نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔

"ہاں' عماد آج کل دبئی میں ہی ہوتا ہے۔ میں دو روز پہلے ملا تھا اس سے۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔" وہ اپنی ہی دھن میں بولے جا رہے تھے۔

"کتنے بچے ہیں آپ کے؟" شاید غائب دماغی میں' میں نے یہ سوال کیا تھا۔

"ایک بیٹی ہے۔" ان کی آواز بہت دھیمی تھی۔

"لیکن میں نے تو سنا تھا' آپ کے دو بچے ہیں؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہاں..... دو بیٹیاں تھیں۔ مگر اب صرف ایک ہے۔" وہ آہستگی سے بولے۔

"اور دوسری؟" جانتے ہوئے بھی میں یہ سوال کر رہا تھا۔

"وہ' وہ مر چکی ہے۔" ان کے لہجے میں گہرا دکھ تھا۔

"اوہ آئی ایم سوری۔" بہت مشکل تھا یہ سب کچھ کہنا میرے لیے۔ اس لڑکی کی موت پر افسوس کرنا' جو میری زندگی تھی..... میرا سب کچھ تھی..... میری محبت تھی۔

اچانک ان کا موبائل بجنے لگا۔ اسکرین پر موجود نمبر دیکھ کر انہوں نے فون فوراً" کان سے لگا لیا۔

"ہیلو..... ہاں! بیٹا کیوں کیا ہو گیا؟ جتنے پیسے چاہئیں واپس آ کر لے لو۔ میں گاڑی بھیجوں یا..... اچھا ٹھیک ہے' ہاں تم آجاؤ۔ تمہیں کسی سے ملوانا ہے۔ ایک زبردست شخصیت میرے سامنے موجود ہیں۔" وہ ہنسے۔ "نہیں نہیں تم ملو گی تو ہالی وڈ اسٹارز کو بھی بھول جاؤ گی۔ ہاں بھئی' کافی ہینڈسم ہے اوکے آل رائٹ! جلدی سے آجاؤ۔" انہوں نے موبائل بند کر دیا۔

"میری بیٹی تھی۔ ابھی آتی ہے تو ملواتا ہوں۔"

"سر! ایسا ہے کہ میں چلتا ہوں۔ میں نے کسی کو ٹائم دے

رکھا ہے۔" میں اٹھتے ہوئے بولا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ماہ نور وہاں آئے اور جہانگیر کے سامنے ماضی کا کوئی ذکر چھیڑے۔

مصافحہ کرتے ہوئے میں نے اردو میں کہا۔ "انشاء اللہ پھر ملاقات ہو گی۔" اس سے پہلے ہم تمام بات چیت انگریزی میں کر رہے تھے۔ میری اردو سن کر وہ تھوڑے حیران ہوئے، پھر مسکرا کر بولے۔

"مجھے بہت کم لوگ متاثر کرتے ہیں، اور تم ان میں سے ایک ہو۔" ان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد میں تیز قدموں سے چلتا ہوا وہاں سے نکل آیا۔



کھلے دروازے پر میں نے زور سے دستک دی۔

کی بورڈ پر تیزی سے انگلیاں چلاتے عماد نے ایک لحظے کو رک کر میری طرف دیکھا، پھر دوبارہ کام میں مگن ہو گیا۔

"اندر آجاؤں؟" میں نے باآواز بلند اجازت طلب کی۔

"اوں ہونہہ!" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیوں؟"

"اتوار کو آنا۔ چھٹی ہوتی ہے، میں فقیروں کے لیے ٹائم نکال لوں گا۔"

"میں تمہیں فقیر نظر آتا ہوں؟" مصنوعی غصے سے کہتے ہوئے میں اندر داخل ہوا۔

"جس طرح تم اجازت مانگ رہے ہو، اس طرح تو فقیر بھی نہیں مانگتے۔ بلکہ ہمیں ہی ان سے معافی مانگنی پڑتی ہے۔" اب کے وہ قدرے بگڑ کر بولا۔ "تمہیں میرے آفس میں آنے کے لیے اجازت کی ضرورت ہے بھلا؟"

اس کا اپنائیت بھرا لہجہ میرے دل کو چھو گیا تھا۔

"اچھا بابا آ گیا ہوں اندر!" میں نے کرسی سنبھالتے ہوئے کہا۔

"ادھر یوا ے ای کب آئے؟" وہ کام چھوڑ کر پوچھنے لگا۔

"صبح پہنچا تھا۔ ایک میٹنگ تھی، اسی سلسلے میں آیا تھا۔"

"سنو۔" وہ مسکراتے ہوئے بتانے لگا۔ "پرسوں میں شیخ جہانگیر سے ملا۔ جانتے ہو انہیں؟" میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ان کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔ ان کی بیٹی تھی۔ سچ خرم! اتنی کیوٹ، اور سوئیٹ تھی کہ میں تو بس اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔"

"ہاں، وہ شکل کی اچھی ہے۔" میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔

"صرف اچھی؟ وہ تو بہت پیاری ہے۔ اس کے بال بھی بہت لمبے اور خوب صورت تھے۔" وہ بتا رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کینٹربری میں جب نے ماہ نور کو دیکھا تھا تو اس کے بال بہت لمبے تھے اور اس نے انہیں ڈائی بھی نہیں کیا ہوا تھا۔ عماد اسے نائس اور سوئیٹ کہہ رہا تھا کیا ماہ نور واقعی بدل گئی تھی؟۔

نجانے کیوں مجھے لگتا تھا کہ جتنا میں ماہ نور سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتا ہوں، قدرت کسی نہ کسی طرح اس کو پھر میرے سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔ ایسا کیوں ہو رہا تھا؟ عماد کچھ دیر اس کی ہی باتیں کرتا رہا۔

"سنو خرم! تمہارے مانچسٹر والے نئے ہوٹل کی جب اوپننگ سیریمنی ہو گی تو اس کا چیف گیسٹ کون ہو گا؟" وہ کسی خیال کے تحت پوچھنے لگا۔

"شیخ جہانگیر۔" میں مسکرایا۔



وہ میرا سب سے بڑا پروجیکٹ تھا۔ میرا پچھتر واں ہوٹل سب سے زیادہ بڑا اور خوب صورت تھا۔

مانچسٹر کے باسی مسلسل بیس گھنٹے سے جاری برف باری سے لاتعلق اپنے روز مرہ کے کاموں میں مگن تھے۔ پورا شہر سفید چاندی سے ڈھکا ہوا تھا۔ ہر طرف برف ہی برف تھی۔ اسی یخ بستہ شام کو میرے ہوٹل کا افتتاح تھا۔

صحافی، نقاد، مانچسٹر کا میئر، پاکستانی کمیونٹی کے کچھ جاننے والے احباب اور سب سے بڑھ کر عماد کی پوری فیملی مدعو تھی۔ مہمان خصوصی شیخ جہانگیر تھے۔

بلیک ڈنر جیکٹ میں ملبوس میں مہمانوں کو ویلکم کر رہا تھا۔ گردن موڑ کر میں نے عماد کو دیکھا۔ فیڈڈ بلیو جینز کے اوپر گرے ہائی نیک پہنے وہ ہمیشہ کی طرح اسمارٹ لگ رہا تھا۔ وہ تیئیس سال کا تھا، مگر میرے لیے وہی اٹھارہ سالہ ٹین ایجر تھا، جس کے آگے کوئی ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ اس کے آگے تو اب بھی کوئی نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ وہ دوسرے کو موقع دیے بغیر ہی بولتا رہتا۔ اس وقت بھی وہ مومنہ اور تجل کو باتوں میں لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی مسلسل چلتی زبان کے سامنے مومنہ سر ہلا رہی تھی، جبکہ تجل بے بسی سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ اسی وقت شیخ جہانگیر مجھے آتے نظر آئے میں انہیں ریسیو کرنے آگے بڑھا۔

ڈنر سوٹ میں وہ ہمیشہ کی طرح ہینڈسم اور باوقار لگ رہے تھے۔ وہ تنہا ہی آئے ہوئے تھے، جبکہ ان کو مع فیملی مدعو کیا گیا تھا۔

مسکراتے ہوئے میں نے ان کے ہاتھ سے "بکے" لیا۔ رسمی کلمات کے تبادلے کے بعد میں نے ان سے اکیلے آنے کا سبب دریافت کیا۔

"میری وائف کو کسی فیشن شو میں شرکت کے لیے کراچی جانا تھا البتہ میری بیٹی کی کوئی فرینڈ آ گئی تھی، ورنہ وہ بھی آجاتی۔" ان کے بتانے پر دل ہی دل میں مجھے خوشی ہوئی تھی۔ میں ذہنی طور پر ماہ نور سے ملنے کے لیے تیار نہ تھا۔ حالانکہ اب وہ مجھے پہلے کی طرح بری نہ لگتی تھی، پھر بھی۔

"آپ کی صاحبزادی تشریف نہیں لائیں؟" عماد چھوٹتے ہی ان سے پوچھنے لگا۔

"نہیں، اس کی کوئی فرینڈ آ گئی تھی۔ اس لیے نہیں آ سکی۔" وہ بیٹھتے ہوئے بولے۔

"خیر، یہ تو بہت پرانا بہانا ہے۔" عماد نے سر ہلا کر معصومیت سے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" وہ بولے۔ "میں تمہارے پاس نئے نئے بہانوں کے لیے کورس کرنے آؤں گا۔"

"ان کو بتائیے گا کہ انہیں یہاں بہت مس کیا گیا ہے۔" وہ بغیر شرمندہ ہوئے کہنے لگا۔

"کس نے کیا مس؟" وہ پوچھنے لگے۔

"میں نے اور کس نے کرنا ہے۔" عماد نے فوراً کہا۔

"وہ بھی تمہارا بہت ذکر کرتی ہے۔ اس دن بھی کہہ رہی تھی کہ ڈیڈ، عماد اس وقت تو بہت اچھا بن رہا تھا، ادھر دبئی میں، مگر بعد میں ایک فون کرنے کی بھی زحمت نہیں ہوئی۔" عماد جھینپ کر مسکرا دیا۔ "وہ کیا ہے کہ وقت ہی نہیں ملتا۔"

"خیر یہ تو بہت پرانا بہانا ہے۔" شیخ جہانگیر ہنستے ہوئے بولے تو عماد کھسیانا سا ہو کر رہ گیا۔ بھرپوری تقریب کے دوران دونوں کی نوک جھونک جاری رہی۔



"ایک تو پہلے ہی میچ نے مجھے تھکا دیا ہے، اوپر سے تم میرا سر کھانے کے لیے بیٹھے ہو۔"

"ظاہر ہے۔" وہ مزے سے بولا۔ "تم کھانا نہیں کھلاؤ گے تو تمہارا سر ہی کھاؤں گا نا!"

"شش..... " میں نے اسے چپ کرایا اور فائل پر جھک گیا، وہ اس وقت میرے آفس میں موجود تھا۔

"چھوڑو بھئی، مجھے دے دو، تم کچھ نہیں کر سکتے۔" اس نے میرے ہاتھ سے فائل چھین لی اور بڑے انہماک سے دیکھنے لگا۔

"اوں ہوں، دو منٹ کا کام ہے اور تم پچھلے آدھے گھنٹے سے ویلے بیٹھے جھک مار رہے ہو۔" عماد فائل دیکھتے ہوئے بولا۔

"دو منٹ کا کام اب رہ گیا ہے مسٹر اسرار تو میں ختم کر چکا ہوں۔"

"چپ رہو، نامعقول!" اس نے اپنے برٹش اردو لہجے میں کہا تو مجھے ہنسی آ گئی۔

"عماد! تمہیں نامعقول کا مطلب بھی پتہ ہے؟"

"نہیں!" وہ صاف گوئی سے بولا۔ "مجھے تو صبح امی نے کہا تھا، نامعقول، تم کسی کام کے نہیں ہو۔"

"اس کا مطلب ہوتا ہے بے وقوف، ایڈیٹ، کم عقل، جس کو تمیز نہ ہو......"

"پھر تو شاید وہ تمہارے لیے کہہ رہی تھیں۔" وہ میری بات کاٹ کر تیزی سے بولا۔ "میں ان سے دوبارہ پوچھ لوں گا۔"

"جی نہیں، میں بہت کام کرتا ہوں۔" میں نے فرضی کالر جھاڑے۔

"جس کے لیے کرتے ہو، اس سے شادی کب کرو گے؟" وہ جرح کرنے کے موڈ میں تھا۔

میں نے سر جھکا لیا۔ اس بات کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

"کیا ہوا خرم؟" وہ ایک دم ہی سنجیدہ ہو گیا۔

"وہ اب نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟ شادی ہو گئی اس کی؟"

"نہیں۔"

"پھر وہ کسی اور کو پسند کرنے لگی ہے؟"

"نہیں۔"

"وہ کہیں چلی گئی؟"

"ہاں وہ چلی گئی۔"

"پاکستان سے چلی گئی؟" وہ پریشان سا ہو کر پوچھ رہا تھا۔

"اس دنیا سے چلی گئی۔ خودکشی کر لی اس نے۔" میں نے تھکے تھکے لہجے میں بتایا۔

"کیا کہہ رہے ہو؟ وہ' وہ مر گئی؟" اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"ہاں۔"

"کب؟" وہ تاسف سے پوچھ رہا تھا۔

"جس روز میں اسے چھوڑ کر گیا تھا اسی دن۔"

کتنی ہی دیر وہ خاموش کھڑا مجھے تکتا رہا۔

"تمہیں کب پتہ چلا۔ یہ سب؟" وہ دھیرے سے بولا۔

"دو برس پہلے ایک کامن فرینڈ سے ملا تھا' اسی نے بتایا تھا۔" میں اپنے لہجے پر قابو پانے کی سعی کرنے لگا۔ میں جان بوجھ کر تفصیلات میں نہیں گیا۔

"خرم! آئی ایم ریئلی سوری ٹو ہیر آل دس۔" وہ چند ثانیے خاموش رہا' پھر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "مگر تم فکر مت کرو۔ ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔"

میں نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ایک پژمردہ سی مسکان میرے لبوں پر بکھر گئی۔

"چلو' شاپنگ پر چلتے ہیں۔" اس کے اصرار پر میں بھی بوجھل دل کے ساتھ اٹھ آیا۔

ASDA مارکیٹ میں کچھ دیر تو ہم ونڈو شاپنگ کرتے رہے' بالآخر ایک گارمنٹ اسٹور پر عماد کو ایک جیکٹ پسند آ گئی۔ ابھی میں جیکٹ میں نقص نکالنے ہی والا تھا کہ میری نگاہ قریب کھڑی اسپینش ناک نقشے والی خاتون پر پڑی۔ وہ ہاتھ میں مفلر پکڑے' عماد کو مسلسل دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے گہرا تاسف چھلک رہا تھا۔ کچھ دیر وہ خاموشی سے عماد کو تکتی رہی۔ پھر مفلر وہیں رکھ کر ہمارے قریب چلی آئی۔

"ایکسکیوزمی بیٹا!" وہ رسانیت سے بولی۔

"یس میڈم!" عماد نے فوراً "خوش اخلاقی دکھائی۔

"تم کون ہو بیٹا؟" وہ محبت و شفقت سے اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"میں' میں عماد ہوں۔ عماد احمد۔" وہ کچھ گڑبڑا کر بولا۔

"تم' تم بالکل رکارڈو کی طرح ہو۔" وہ دھیرے سے بولی۔

"کون رکارڈو؟" عماد پوچھنے لگا۔

"میرا بیٹا' رکارڈو' تم اسی کی طرح خوب صورت اور قد آور ہو' تمہارے بال بھی بالکل اس جیسے ہیں اور' اور آنکھیں بھی۔ میں نے جب' تمہیں دیکھا تو یوں لگا کہ شاید میرا رکی کھڑا ہے۔ میں سمجھی وہ' وہ واپس آ گیا ہے۔" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

عماد نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ میں نے شانے اچکا دیے۔

"آپ کا بیٹا کہاں ہوتا ہے؟" عماد اس عورت سے پوچھنے لگا۔

"وہ' وہ نیویارک میں ہوتا تھا۔ ۱۱ ستمبر کو اپنے دوست سے ملنے ٹوئن ٹاورز گیا تھا۔ پھر' پھر وہاں اٹیک ہو گیا۔ رکی واپس نہ آیا۔ وہاں کچھ بھی نہ بچا کوئی بھی واپس نہ آیا۔" اس کی آنکھیں اب جھلملانے لگی تھیں۔ "آج تمہیں دیکھ کر یوں لگا کہ شاید رکی واپس آ گیا ہو۔ مجھے لگا' ابھی تم آؤ گے اور مجھے کہو گے' ممی میں آ گیا ہوں۔ ممی آپ کا رکی آ گیا ہے۔ مگر تم تو' تم تو رکی نہیں ہو۔ تم تو عماد ہو' وہ' وہ اب بھی واپس نہیں آئے گا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔

میری طرح عماد بھی پریشان ہو گیا تھا۔

"اگر میں آپ کے لیے کچھ کر سکوں میم؟" وہ خلوص سے بولا۔

"نہیں' تم کیا کر سکتے ہو' سوری میں نے تمہارا ٹائم لیا۔" وہ آنسوؤں کے درمیان مسکرائی تھی۔

"پھر بھی؟" وہ بضد تھا۔

"بس ایک احسان کر دو مجھ پر! جب میں جانے لگوں تو دایاں ہاتھ ہلا کر صرف ایک دفعہ مجھے "ہائے ممی" کہہ کر پکارنا' بالکل اس طرح جیسے رکی پکارتا تھا۔ آنے والے دنوں میں مجھے حوصلہ ملتا رہے گا۔ ایک امید سی بندھی رہے گی کہ وہ ان فضاؤں میں کہیں نہ کہیں موجود ہے۔ پلیز!" وہ ملتجی لہجے میں بولی تو عماد نے فوراً "سر ہلا دیا۔

وہ عورت کاؤنٹر پر گئی' سیلز مین سے کچھ کہا اور اپنے شاپرز اٹھا کر داخلی دروازے کی طرف بڑھی۔

"ممی!" عماد نے زور سے پکارا "ہائے ممی!"

اس اسپنش عورت نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور مسکرائی۔ اس کی آنکھوں میں دوبارہ ایک چمک سی پیدا ہوئی تھی' مگر اس دفعہ یہ آنسوؤں کی نہیں تفاخر اور تسخیر کی تھی۔ اس نے عماد کی طرف ہاتھ ہلایا اور باہر نکل گئی۔

عماد خاموشی سے کھڑا اپنے جوتوں کو تکتا رہا۔ اس نے اس عورت کی باتوں کا زیادہ ہی اثر لے لیا تھا۔

"عماد چلیں؟" میں نے اسے دھیرے سے پکارا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور ہولے سے مسکرا دیا۔ جیکٹ لے کر ہم کاؤنٹر پر پہنچے۔ وہ ابھی تک سوچوں میں گم تھا۔ اس کے خیالات کا تسلسل اس وقت ٹوٹا جب سیلز مین نے اسے بل تھمایا۔ بل پڑھتے ہوئے وہ چونک پڑا۔

"ڈیڑھ سو پاؤنڈز؟ آر یو کریزی؟" یہ جیکٹ تو محض 65 پاؤنڈز کی ہے اور یہ باقی اشیاء کیوں لکھی ہیں' یہ تو میں نے نہیں خریدیں۔"

"سر! یہ ان میڈم کا بل ہے جو ابھی کچھ دیر پہلے یہاں سے گئی ہیں۔"

"لیکن میں اس کا بل کیوں پے کروں؟"

"وہ کہہ رہی تھیں یہ لڑکا میرا بیٹا ہے' یہ میرا بل ادا کرے گا۔"

"لیکن وہ میری مدر تو نہیں تھی۔" عماد چلایا۔

"لیکن سر! آپ نے خود ہی تو اتنی اونچی آواز میں انہیں ہائے ممی کہا تھا۔" سیلز مین اب حیران سا ہو کر اسے دیکھ رہا تھا۔

"لیکن وہ تو....." عماد نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا۔ میں نے جواباً" زور کا قہقہہ لگایا۔ کیا کمال اداکاری کی تھی اس نے۔ چاروناچار عماد نے بل بھر دیا۔ واپسی پر سارا راستہ اس کا موڈ خراب رہا۔

میرا کاروبار بے حد ترقی کر رہا تھا۔ اور اب میرے ہوٹل دنیا کے کئی ممالک میں موجود تھے۔ ان ملک کے تقریباً" ہر بڑے شہر میں موجود تھے۔ اور میں' خرم زید' اب تھک چکا تھا۔

میں کہاں سے شروع ہوا تھا اور کہاں پہنچ گیا تھا؟۔

کال سینٹر پر ٹیلی فون آپریٹر اور ایک عالیشان ہوٹل پر ایک معمولی سے بیرے سے شروع ہو کر میں انگلینڈ کے گنے چنے طاقتور ہوٹیلئیرز میں سے ایک بن چکا تھا۔ جتنا میں نے چاہا تھا' اس سے کہیں زیادہ مجھے مل گیا تھا۔ لیکن اس وقت بھی مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں؟ یہ راستہ کہاں جاتا ہے؟ کامیابی کی طرف یا تباہی کی طرف؟ نجانے کب مجھے ٹھوکر لگے' کب میں گر پڑوں' کب پلٹ آؤں؟ یہ اندھی سڑک کہاں جا رہی تھی' مجھے نہیں معلوم تھا۔

کبھی کبھی اگر رات کو کوئی لمحہ مجھے فارغ مل جاتا تو میں کھڑکی کھول کر سیاہ آسمان پر ہنستے مسکراتے چاند کو دیکھتا۔ کبھی وہ مجھے بہت حسین لگتا' کبھی بہت بدصورت' اس کے اندر ایک بدصورتی تھی جسے سورج سے چرائی گئی روشنی خوب صورتی بخش رہی تھی۔ مایوس ہو کر میں کھڑکی بند کر دیتا اور سوچتا کہ میں کہاں جا رہا ہوں؟ اگر میں دس ہزار ہوٹلز بھی بنا لوں' بل گیٹس سے بھی زیادہ امیر ہو جاؤں تو پھر؟ پھر کیا ہو گا؟ کیا سمل واپس آ جائے گی؟ کیا دنیا کی کوئی طاقت سمل کو واپس لا سکتی ہے؟ پھر کیا فائدہ اس دولت کا جو کسی کو اس کا سچا پیار نہ لوٹا سکے؟

کیا مجھے سمل واپس مل جائے گی؟ کیا مجھے کوئی اور لڑکی ملے گی جو اس جیسی ہو؟ شاید کوئی بہت خوب صورت لڑکی مجھے مل جائے تب بھی وہ سمل تو نہیں ہو گی؟ وہ سمل کی طرح مسکرائے گی بھی نہیں' وہ سمل کی طرح روئے گی بھی نہیں۔ کوئی بھی لڑکی وہ نہیں ہو سکتی جو سمل تھی! اس کی جگہ کوئی اور نہیں لے سکتا۔ وہ بس ایک تھی! صرف ایک'

اگر میرے پاس اس کی یادیں' اس کا احساس اور خیال نہ ہوتا' اگر میرے دل میں اس کے آنسو اور مسکراہٹیں محفوظ نہ ہوتیں' میرے لاشعور میں وہ معصوم سی لڑکی نہ بستی ہوتی تو میں جی نہ پاتا۔

یہ سمل کا تصور تھا جو مجھے زندہ رکھے ہوئے تھا۔ یہ اس کی گہری آنکھیں تھیں' جو میری ہر کامیابی کو دیکھتی تھیں' یہ اس کی محبت کے جگنو تھے جو اس تاریک راہ پر مجھے راستہ دکھاتے تھے! وہ کبھی بھی میری زندگی سے نہیں نکلی تھی۔ وہ میرے ساتھ تھی' ہر لمحہ' ہر پل۔



مومنہ شادی کے بعد شارجہ جبکہ سونیا لاہور چلی گئی تھی۔ تجل کے لیے میرے شیڈول میں سے وقت نکالنا بہت مشکل تھا۔ سو وہ بھی لاہور چلی گئی اور وہیں اپنی تعلیم مکمل کرنے لگی۔

میری راتیں اب بھی ویسی ہی تھیں۔ نیند کی گولیوں کے بغیر میں سو نہیں سکتا تھا۔ اس اذیت سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنے ہوٹلز چلا جاتا۔ مانچسٹر میں میں کم ہی ہوتا تھا۔ زیادہ تر ملک سے باہر رہتا تھا' اور لیڈز گئے ہوئے تو تین چار سال ہو ہی گئے تھے۔

اس رات مجھے اپنے پرانے شہر کی بہت یاد آئی۔ ایسی یاد

اسلام آباد کی بھی آتی تھی' مگر وہاں تلخ یادیں بھی تھیں۔ نجانے کیوں میں نے پاکستان میں کوئی ہوٹل نہیں بنایا تھا نہ ہی کبھی واپس جانے کا سوچا۔

میں اسی رات لیڈز آ گیا۔ ایئرپورٹ سے سیدھا ہوٹل پہنچا اور تقریباً" نصف گھنٹے بعد گاڑی اڑاتا ہوا وینس برج کی جانب گامزن تھا۔

"وینس برج" پر میں اپنی بہت سی یادیں چھوڑ کر گیا تھا۔ یہ میرے لیے ایک انسٹی ٹیوٹ کی مانند تھا' جہاں صرف ایک سال گزار کر میں نے بہت تجربہ حاصل کیا تھا۔

مجھے آج بھی وہ شب و روز یاد تھے جب میں وہاں ڈیوٹی منیجر تھا۔ ہوٹل میں میرا اپنا کمرہ تھا' لیکن میں سب کچھ لاؤنج میں بیٹھ کر کیا کرتا۔ دوپہر کو ریسٹورنٹ کے لنچ کی تیاری کے لیے آلو' گاجر اور بند گوبھی کاٹا کرتا تھا۔ اگر عماد آ جاتا تو ہم جلدی آلو کاٹنے کا مقابلہ کرتے۔

عماد سے ملے بھی سال ہو گیا تھا۔ کبھی کبھار انٹرنیٹ پر بات ہو جاتی' اتفاق سے اگر ہم دونوں آن لائن ہوتے تو چیٹ ہو جاتی' ورنہ سوائے چند ایک "فارورڈ میلز" کے میں نے اسے کافی عرصے سے کوئی ای میل بھی نہیں کی تھی کبھی اس کا فون آ گیا یا میں نے کال کر لی تو ٹھیک ورنہ تو اس کی شکل دیکھے بھی کافی عرصہ ہو گیا تھا۔

وہ اب وینس برج سنبھالتا تھا۔ صفوان' شارجہ میں ہوتا تھا۔ اس کی تو شادی بھی ہو گئی تھی اور دو یا تین بچے بھی تھے۔ البتہ عماد سے میں جب بھی شادی کا کہتا' تو وہ سر جھٹک کر جواب دیتا "لڑکیاں تو سر کا درد ہوتی ہیں۔"

وہ اپنے آفس میں بیٹھا فون پر محو گفتگو تھا جب میں بغیر دستک کے اندر داخل ہوا۔ مجھے دیکھ کر اس نے فوراً" فون رکھ دیا اور میرے سینے سے لگ گیا۔

"کب آئے تم؟" وہ خوشگوار حیرت سے پوچھنے لگا۔

"بالکل ابھی!" میں نے بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"خیریت' اتنے عرصے بعد ہماری یاد کیسے آ گئی؟"

"بس! لیڈز والوں کی یاد آ رہی تھی' سوچا شکل ہی دکھا دوں' تم تو ملتے ہی نہیں' میں ہی آ جاؤں۔"

"واہ! کیا خوب کہی۔ تم تو جیسے روز ڈنر میرے ساتھ کرتے ہو نا!" وہ تڑ سے بولا۔

"اب آ تو گیا ہوں یار!" میں نے تھکے تھکے لہجے میں کہا۔

"اچھا بتاؤ' کیا کھاؤ گے؟" وہ سدا کا مہمان نواز' پوچھنے لگا۔

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "کھانا کھا کر آ رہا ہوں۔ تم سناؤ گھر میں سب کیسے ہیں؟"

"ٹھیک ہیں!" وہ دھیرے سے بولا۔

"اور سناؤ فریا کیسی ہے؟" میں نے یونہی پوچھ لیا۔

"ٹھیک ہے۔ کل میری بات ہوئی تھی اس سے' اپنے ہزبینڈ کے لیے رشین سیلڈ بنا رہی تھی۔ وہ لوگ دو روز تک انگلینڈ آ رہے ہیں۔"

"ویری گڈ!"

پھر کافی دیر ہم فضول گپیں ہانکتے رہے۔

تقریباً" آدھے گھنٹے بعد میری گاڑی لیڈز کی سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔

ہر گزرتی سڑک کے ساتھ نجانے کتنی یادیں وابستہ تھیں۔ میں نے زندگی کے تین سال اس شہر میں گزارے تھے اور مانچسٹر میں اس سے دگنا عرصہ گزارا تھا' مگر لیڈز میں گزارے وہ ماہ و سال مجھے یاد تھے۔ مجھے اس شہر کی گلیوں اور مکانوں میں اپنا عکس' اپنا ماضی نظر آ رہا تھا۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے پچھلے چھ برس بیچ میں ہی کہیں رہ گئے ہوں۔

میں تو یہاں سے کبھی گیا ہی نہیں تھا۔ اس جگہ میں اپنا بہت کچھ چھوڑ آیا تھا۔

جب تک میں یہاں تھا' یہی سمجھتا رہا کہ وہ زندہ ہے اور اس کے لیے محنت کرتا رہا۔ بعد میں لندن جا کر اصل حقیقت کا علم ہوا' اس کے بعد گزرنے والے روز و شب وقت کی دھول میں گم ہو کر رہ گئے تھے۔

نہ جانے وہ برس کہاں بیتے تھے؟ بلکہ وہ تو شاید میری زندگی میں آئے ہی نہیں تھے۔ میرا دل تو ابھی چھ سال پیچھے تھا' اس گھڑی سے آگے بڑھا ہی نہیں تھا۔

"لیڈز جنرل انفرمری۔" کو دیکھ کر مجھے 1997ء کی سردیوں کے وہ دن یاد آ گئے' جب چیسٹ انفیکشن کے باعث میں دو روز تک اس ہسپتال میں داخل رہا تھا۔

وارنر ویچ سینما کے سامنے سے گزرتے ہوئے میرے ذہن کے پردے پر وہ دن نمودار ہوا جب میں' عماد' عمر' صفوان اور حیدر "ٹائی ٹینک" دیکھنے کے لیے یہاں آئے تھے اور واپسی پر عماد اور عمر کی زبردست لڑائی ہوئی تھی.....

ہیڈنگلی کرکٹ اسٹیڈیم کے قریب جا کر بے اختیار مجھے پاکستان اور انگلینڈ کے درمیان کھیلا گیا وہ کرکٹ میچ یاد آ گیا

دیکھنے کے لیے میں نے عماد کو فون کر کے ہوٹل بلا لیا اور خود اسٹیڈیم جا پہنچا' مگر عماد خود بھی وہیں بیٹھا میچ دیکھ رہا تھا..... موریسن مارکیٹ اور ASDA شاپنگ مال سے فریا کی شادی کے لیے گھنٹوں ہم نے شاپنگ کی تھی۔

ہیڈ ہلز کے کارنر پر ایک پاکستانی کی دکان سے ہم اکثر چکن تکہ یا پکوڑے کھایا کرتے تھے.....

میں کیا کیا یاد کرتا؟ اس شہر کی ہر سڑک' ہر عمارت اور ہر دکان سے کتنی زندگی جھلکتی تھی۔ وہ زندگی جو کبھی میرے اندر ہوتی تھی' جو میرے لہو' میری روح میں شامل تھی۔ وہ جذبہ' وہ جوش اور زندہ دلی جو میری رگوں میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ وہ محبت جو میرے من میں موجود تھی۔ تب میرا دل زندہ تھا' اس کے اندر کسی کی محبت' کسی کو پا لینے کا جذبہ مچلتا تھا' مگر اب وہ ایک ویران گوشے کی مانند تھا' جہاں صرف کھنڈر تھے اب میرے دل نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ صرف میرا دماغ چوبیس گھنٹے کام کرتا' مجھے پیسہ بنانے کی مشین بنائے رکھتا۔

اور پھر میں نے وہ جگہ دیکھ لی۔

میڈم کیرن کا پب۔

میرے قدم خود بخود پب کی جانب اٹھ گئے۔

سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا میں نو برس پہلے چھوڑ کر گیا تھا۔ پہلی دفعہ میں یہاں آیا تھا تو مجھ پر حیرت اور خوف کا غلبہ تھا۔ اس دفعہ مجھ پر ایک بے خودی سی طاری تھی۔ ایک عجیب سا احساس مجھے یہاں کھینچ لایا تھا۔

وہ کونے میں رکھی اسی میز پر بیٹھی تھی جہاں کئی برس پہلے ہم بیٹھے تھے۔ اس نے آج بھی گرے بلاؤز اور اسکرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کا چہرہ اب بھی ویسا ہی شگفتہ اور جوان تھا۔ مجھے دیکھ کر آج بھی وہ مسکرائی تھی۔

میں آرام سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی خرم!" وہ ہولے سے بولی۔

"کب سے؟"

"جس دن سے تم یہاں سے گئے تھے' اس لمحے سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔"

"تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے میڈم! وہ مجھے یاد نہیں کرتی' وہ میرے لیے نہیں روتی کیونکہ وہ اس دنیا سے کب کی جا چکی ہے۔ وہ کب کی مجھ سے روٹھ کر یہ کائنات چھوڑ چکی ہے۔ کیا تم جانتی نہیں تھیں' یا مجھ سے حقیقت کو چھپا لیا؟" وہ چند لمحے خاموشی سے مجھے تکتی رہی۔

"بتاؤ نا میڈم! کیوں کیا تم نے میرے ساتھ اس طرح؟"

"اس لیے تو کہتی تھی خرم کہ واپس چلے جاؤ۔ مگر تم نہیں گئے۔ اگر چلے جاتے تو اتنا بوجھ نہ ہوتا تمہارے دل پر۔"

"مگر کیا فائدہ ہوتا واپس جانے کا؟"

"بزنس مین ہو نا! فائدہ نقصان دیکھتے ہو۔"

"کیا فرق پڑتا ہے میڈم! وہ واپس تو نہیں آ سکتی نا۔" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"خرم! وقت انسان کو بدل دیتا ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"مگر میں نہیں بدلا۔"

"میں تمہاری بات نہیں کر رہی۔"

"پھر؟"

"میں اس کی بات کر رہی ہوں۔"

"کس کی؟"

"وہ بہت بدل گئی ہے۔ وہ اب ویسی نہیں رہی جیسے پہلے تھی۔ وہ تمہارے لیے بدلی ہے' کیونکہ وہ تم سے محبت کرتی ہے۔"

"کون؟" وہ خاموش رہی تو میں خود ہی بول پڑا۔ "ماہ نور۔"

"تم چاہتے تھے شیخ جہانگیر تمہیں داماد کی حیثیت سے قبول کر لیں۔ اب تمہاری خواہش پوری ہو سکتی ہے۔" وہ مسکرائی "اس کی بیٹی سے شادی کر کے۔"

"لیکن وہ تو مر گئی ہے۔"

"ہاں۔" اس نے گہری سانس بھری۔ "بہت تکلیف میں مری تھی وہ! ایک عام سے ہسپتال کے چھوٹے سے وارڈ میں' موت کے وقت سوائے بہن کے' کوئی نہیں تھا اس کے پاس۔ لیکن شیخ جہانگیر کی دو بیٹیاں تھیں۔ ایک مر گئی تو دوسری تو زندہ ہے۔"

"میڈم!" میں نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"جاؤ صبح آفس میں آنے والا پہلا پرپوزل سائن کر لینا۔" اتنا کہہ کر وہ اٹھی اور وہاں سے چلی گئی۔

تھکے تھکے قدموں سے چلتا ہوا' میں پب سے باہر نکل آیا۔

اسی رات میں مانچسٹر واپس چلا گیا۔

صبح آفس میں سب سے پہلا پروپوزل "القریش انٹرپرائزز" کی جانب سے تھا۔ وہ پاکستان میں ایک سیون اسٹار ہوٹل بنانا چاہتے تھے۔ اس کے لیے میرا تعاون درکار تھا۔ 8 اکتوبر کے زلزلے کے پیش نظر مجھے انکار کر دینا چاہیے تھا مگر جس کنسٹرکشن کمپنی کو ہائر کیا گیا تھا وہ پاکستان کی مشہور "جہانگیر بلڈرز شیخ" تھی۔ میرے جیسے عقل مند اور ذہین و فطین انسان نے ایک نیم پاگل سائیکک کی بات مانتے ہوئے کنٹریکٹ سائن کر لیا۔

اسی سہ پہر جہانگیر بلڈرز کی چیئرپرسن اور القریش انٹرپرائزز کے چیئرمین کے ساتھ میری میٹنگ لندن میریٹ میں تھی۔

میں جانتا تھا "جہانگیر بلڈرز" کی چیئرپرسن ماہ نور تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی میں اس سے ملنے چلا گیا میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ مغرور لڑکی بدلی ہے یا نہیں۔

وقت مقررہ سے دس منٹ پہلے ہی میں میٹنگ کے لیے پہنچ گیا۔ قریباً" دو منٹ میں نے گھوم پھر کر لاؤنج کا جائزہ لیا۔ جس چیز نے مجھے اپنی جانب متوجہ کیا وہ سینٹرل ٹیبل پر رکھے ہینڈ بیگ کے نیچے پڑی کتاب تھی۔

ماہ نور اور کتاب؟ یہ ناممکن تھا۔

تو کیا وہ واقعی بدل گئی تھی؟

اس وقت وہ بالکونی میں تھی کیونکہ وہاں کھلنے والا دروازہ نیم وا تھا۔ میں نے اس کا بیگ اٹھا کر نیچے رکھی گئی ہیری پوٹر نکالی۔ یہ ہیری پوٹر کا چھٹا پارٹ تھا۔ ماہ نور نے اس طرح کی کتابیں کب سے پڑھنا شروع کر دیں؟ میں کافی حیران ہوا تھا۔

جس وقت میں کتاب کے صفحے الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا' بالکونی کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی تھی۔ ایٹی کیٹس کے مطابق مجھے کھڑے ہو کر اسے خوش آمدید کہنا تھا مگر میں اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہل سکا۔

میں اس لڑکی کے لیے کھڑا بھی نہ ہو سکا جس سے پچھلے نو برس میں نے بے تحاشا محبت کی تھی.....

میں نے بیساکھی کے سہارے اندر آتی سمل جہانگیر کو سر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

☼ ☼ ☼

اس کو بچانے کی ذمہ دار منسٹر آف ہیلتھ کی مسز تھیں۔ اگر ان کی پارٹی کے دوران مسز جہانگیر سے نوک جھونک نہ ہو جاتی اور مسز جہانگیر غصے میں واپس گھر نہ آجاتیں تو [illegible] اپنی بڑی بیٹی کو کچن میں تڑپتا ہوا نہ دیکھتیں اور نہ ہی [illegible] اسپتال پہنچا پاتیں۔

پوری دنیا میں خودکشی ایک ایسا جرم ہے' جس میں اگر "مجرم" کامیاب ہو جائے تو سزا سے بچ جاتا ہے اور اگر ناکام ہو جائے تو اسے قانوناً" اور اصولاً" سزا ملتی ہے۔

مگر قانون اور اصول سینئر جہانگیر پر لاگو نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ جس ہسپتال میں اسے لایا گیا تھا' وہ شیخ جہانگیر کا تھا۔

جس اے ایس پی کی اس کیس پر ڈیوٹی لگی تھی' اس کا چھوٹا بھائی شیخ جہانگیر کی کنسٹرکشن کمپنی میں کام کرتا تھا۔

اور شیخ جہانگیر اس وقت سینیٹ کے سب سے [illegible] سینیئر تھے۔ اسی لیے معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

ویسے بھی کسی کی اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ شیخ جہانگیر کو چیلنج کر سکے اس لیے یہ بات کسی کے منہ پر نہ آئی کہ شیخ جہانگیر کی بیٹی نے خودکشی کی کوشش کی ہے۔

☼ ☼ ☼

سمل نے اپنے بھاری پپوٹے اٹھائے تو نگاہ کے سامنے مما کا دھندلا سا چہرہ دکھائی دیا۔ ان کی دھیمی سی پکار اس کی سماعت سے ٹکرائی مگر وہ اتنی ہلکی تھی کہ وہ بمشکل ہی سن پائی۔ پھر ان کا چہرہ دھیرے دھیرے دھند میں گم ہو گیا۔

دوبارہ جب اس کی آنکھوں کے دریچے وا ہوئے تو رات گہری ہو چکی تھی۔ کمرے میں نیم تاریکی پھیلی ہوئی تھی کھڑکی کے ادھ کھلے پردے سے چھن کر آتی چاند کی دھیمی دھیمی چاندنی نے ماحول کو بہت سحر انگیز بنا دیا تھا۔

اس نے پلکیں جھپکائیں تو منظر قدرے بہتر ہو گیا۔ یہ ہسپتال کا ایک وسیع اور کافی کھلا سا پرائیویٹ روم تھا۔ سر گھما کر اس نے اپنے بائیں جانب لگی ڈرپ کو دیکھا' جس کا "کینولا" اس کے جسم میں شاید تھوڑی دیر پہلے تک لگا ہوا تھا۔ شاید پہلے اسے ڈرپ لگی ہوئی ہو' مگر اس وقت تک اتر چکی تھی۔

سائیڈ ٹیبل پر سرخ گلابوں کا ایک بہت خوب صورت گلدستہ رکھا تھا۔ سامنے بڑی میز پر ڈھیر سارے گفٹس اور پھول رکھے تھے۔ دائیں جانب کاؤچ پر کوئی نیم دراز تھا جسے وہ گردن نہ موڑ سکنے اور نیم تاریک ماحول کی وجہ سے دیکھ نہ پائی تھی۔

وہاں جگہ کیوں تھی؟ وہ ذہن پر زور دینے لگی۔ وہ اپنی لائبریری میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی' جب کوئی آیا تھا؟ کون آیا تھا؟ وہ سوچنے لگی..... شاید صوفیہ اندر داخل ہوئی تھی۔ مگر صوفیہ کون تھی؟ اور اختر کون تھا؟ نہیں صوفیہ اور اختر تو اس کتاب میں تھے۔ جو وہ پڑھ رہی تھی۔

"کیا نام تھا اس کا؟" اس کو ٹھیک سے یاد نہیں آ رہا تھا۔ پھر اندر کون داخل ہوا تھا؟

مما' مما اندر داخل ہوئی تھیں اور کیا کہا تھا انہوں نے؟ ہاں' اسے کچھ یاد آیا' انہوں نے اسے پارک میں چلنے کو کہا تھا' پھر راستے میں ہی کچھ ہو گیا اور وہ یہاں پہنچ گئی۔ شاید سب ایسے ہی تھا۔

نہیں..... بیچ میں کچھ مسنگ تھا۔ مما اسے پارک لے کر گئیں اور وہ یہاں آ گئی۔ ان دونوں واقعات کے درمیان کچھ اور بھی ہوا تھا کیا ہوا تھا؟

اور پھر بہت اچانک سے اسے یاد آیا۔ وہ سفید پھول جو اسے پارک میں کسی بچے نے لا کر دیا تھا اسے یاد آ گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی باقی سب کچھ بھی امڈ کر نگاہوں کے سامنے آ گیا۔

وہ اسے چھوڑ کر چلا گیا۔

کیونکہ اسے سمل سے نہیں' اس کی دولت سے محبت تھی۔ خرم کی نگاہ سمل کے باپ کی اربوں کی جائیداد پر تھی' جو اس سے شادی کی صورت میں اسے مل سکتی تھی۔

لیکن کیا سمل اتنی بے وقعت تھی کہ وہ اسے یوں چھوڑ کر چلا گیا؟

"تو خرم زید' تمہاری محبت تو محض ناٹک نکلی' تمہارا پیار دھوکا نکلا۔ لیکن وہ محبت جو میں نے تم سے کی تھی' وہ سچی اور بے لوث محبت تھی۔

تم کچھ تو کہتے خرم! اپنے اس طرح جانے کی وجہ ہی بیان کر دیتے! لیکن تمہارے اس طرح جانے کی ایک ہی وجہ ہے' کہ تمہارے نزدیک میری کوئی وقعت نہیں ہے۔ تمہارے دل میں میری حیثیت ایک عام اور معمولی لڑکی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ تم تو میرا سب کچھ لوٹ کر لے گئے میرے خواب' میرے جگنو۔

"کم صورتی اور معذوری کسی کو معمولی اور غیر اہم نہیں بنا دیتی" یہ بات تم نے ہی کہی تھی۔ یہ سبق بھی تم نے ہی مجھے دیا تھا کہ "دنیا سے لڑنا سیکھو' ثابت کرو کہ تم اہم ہو۔"

"کیا میں اسے بھلا پاؤں گی؟" رات کے اس پہر سمل جہانگیر نے خود سے سوال کیا تھا۔

صبح ہونے کے قریب' اسپتال کے اس پرائیویٹ روم کے بستر پر لیٹی سمل جہانگیر نے خود سے یہ وعدہ کیا کہ وہ اس دنیا پر یہ ثابت کرے گی کہ وہ کم ہمت' بزدل اور معمولی لڑکی نہیں ہے۔

☼ ☼ ☼

پانچ روز بعد اسے ڈسچارج کر دیا گیا۔

وہ گھر آتے ہی بنا کسی سے بات کیے' اپنے کمرے میں چلی گئی۔

الماری سے ایک عام سا کاٹن کا سوٹ نکال کر وہ باتھ روم کی طرف بڑھی ہی تھی کہ یاد ماضی سے اس کی آواز نکل کر سمل کی سماعت سے ٹکرائی۔

"یہ جو تمہارا حلیہ ہے' یہ ایک لڑکی کا حلیہ نہیں ہوتا۔" سمل نے بغور اس سبز کاٹن کے جوڑے کو دیکھا کیا کوئی باذوق لڑکی اس طرح کے فضول کپڑے پہنے گی؟"

جواب نفی میں تھا۔

اس نے اپنی وارڈروب کھول کر تمام کپڑوں کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا۔

میرون' براؤن' گرے' سیاہ' ڈارک پرپل اور نیوی بلیو بس یہی کلرز تھے اس کے زیر استعمال کپڑوں میں۔

"تم کوئی عام سی لڑکی نہیں ہو جو عام سے لباس میں رہو۔ خود اپنے آپ کو خاص اور اہم فیل کرو گی تو لوگ تمہیں "اہم" جانیں گے۔"

اس نے دوسری الماری کھولی۔ مما اکثر و بیشتر اس کے لیے کپڑے لاتی تھیں جنہیں اس نے کبھی ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ لیکن اب اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ خرم کیوں اسے صحیح طور پر ڈریس اپ ہونے کے لیے کہتا تھا؟ وہ صرف بیس برس کی تھی' جبکہ اس کے وارڈروب کی کلر اسکیم پچاس سال کی معمر خاتون والی تھی۔

اس نے مما کا خریدا ہوا ایک خوب صورت اور اسٹائلش پنک اور وائٹ کلر کا سوٹ زیب تن کیا' ماہ نور کے لائے گئے نازک سے جوتے پہنے' اسلام آباد کے موسم کی مناسبت سے لائٹ پنک سوئیٹر پہنا' بال برش کیے اور کمرے سے باہر نکل آئی۔ اس کا رخ پورچ کی جانب تھا۔

"رحیم!" اس نے ڈرائیور کو آواز دی "گاڑی نکالو' مجھے

ڈیڈ کے آفس جانا ہے۔"

"بی بی! گاڑی تو فارغ نہیں ہے۔ دراصل بیگم صاحبہ اپنی گاڑی لے گئی ہیں اور صاحب کی گاڑی بھی نہیں ہے۔" رحیم لاپروائی سے بتانے لگا۔

"تو یہ تمہارے سامنے کچھ نہیں ہے یا اندھے ہو؟" اس نے سامنے کھڑی لینڈ کروزر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ؟ اس میں تو ماہ نور بی بی جائیں گی۔"

"ماہ نور بی بی کی اپنی گاڑی کہاں ہے؟" سمل کو یاد تھا ماہ نور کے پاس ایک ریڈ اسپورٹس کار تھی۔

"وہ جی ان کی گاڑی ورکشاپ میں ہے۔ اس لیے وہ اسی میں جائیں گی۔ ابھی کچھ دیر ہوئی' وہ مجھے انتظار کرنے کو کہہ کر گئی ہیں' ابھی آتی ہی ہوں گی۔"

"ماہ نور بی بی پھر کبھی چلی جائیں گی۔ تم گاڑی نکالو۔ مجھے ضروری جانا ہے۔" وہ اسے گھورتے ہوئے تیز لہجے میں بولی۔

چاروناچار رحیم کو گاڑی نکالنا ہی پڑی۔

آفس میں سمل کو کوئی خاص پروٹوکول نہ ملا۔ وہاں کوئی اسے جانتا جو نہ تھا۔ وہ سب شیخ جہانگیر کی نازک مزاج اور خوب صورت بیٹی کو جانتے تھے ایک کم شکل اور لنگڑی لڑکی کا ان کے باس سے کیا تعلق ہو سکتا تھا بھلا؟

جیسے ہی اس نے ریسپشنسٹ سے اپنا تعارف کرایا' اطراف میں کام کرتے "سامعین" کے ہاتھوں میں ایک دم تیزی سی آ گئی۔

وہ چھٹے فلور پر واقع ڈیڈ کے پرسنل آفس جانے کے لیے لفٹ کی طرف بڑھی ہی تھی کہ ریسپشن پر موجود لڑکی نے ساتھ چلنے کی آفر کی۔ جواباً سمل نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے اس کے سر پر سینگ ہوں۔

"میں کسی کی محتاج نہیں ہوں۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی تو وہ لڑکی شرمندہ سی ہو کر رہ گئی تھی۔ سمل تیزی سے مڑی اور باوقار انداز سے چلتی ہوئی لفٹ میں داخل ہو گئی۔

شیخ جہانگیر کے آفس کے سامنے ٹیبل پر موجود ان کی سیکرٹری نے اس کو روکنا چاہا۔

"میم' آپ اندر نہیں جا سکتیں۔" وہ جلدی سے بولی۔

"باس مصروف ہیں۔"

سمل نے صرف ایک لاتعلق سی نگاہ اس پر ڈالی اور نہایت اعتماد کے ساتھ اندر چلی گئی۔ اندر شیخ جہانگیر کے علاوہ چار افراد موجود تھے۔ سمل کو یوں اچانک دیکھ کر شیخ جہانگیر بولتے بولتے یکدم خاموش ہو گئے۔ ان کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ایکسکیوزمی جنٹلمین! آپ پھر آیئے گا۔ مجھے ابھی اپنے فادر سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔" وہ خاصے تحکمانہ انداز میں بولی تھی۔

جہانگیر کے کہنے پر تمام افراد رخصت ہو گئے تو وہ ان کے سامنے بیٹھ گئی۔

"خیریت بیٹا؟" وہ پریشان ہو گئے تھے۔ "کیا بات ہے؟"

"بتاؤں گی۔ پہلے آپ اپنی سیکرٹری کو بلایئے۔" وہ آرام سے بولی۔

چند سیکنڈ بعد ان کی سیکرٹری ثانیہ وہاں موجود تھی۔

"ڈیڈ!" وہ جہانگیر سے بولی۔ "آپ ابھی اور اسی وقت اس لڑکی کو جاب سے فارغ کریں۔ اس نے مجھ سے بدتمیزی کی' مجھے یہاں آنے سے روکا آپ ابھی اس کو آفس سے نکالیں۔"

چند لمحے وہ بغور اپنی بیٹی کا چہرہ دیکھتے رہے' پھر ثانیہ کی طرف مڑے "تم اپنی چیزیں سمیٹ لو' کیشئر کے پاس جا کر اپنا حساب کروا لو اور یہاں سے جانے سے پہلے سب کو بتا دینا کہ میری بیٹی سے بدتمیزی کرنے والے کو اس سے بھی سخت سزا ملے گی۔ اب' تم جا سکتی ہو۔"

جب وہ چلی گئی تو وہ اس سے مخاطب ہوئے۔ "اب بتاؤ بیٹا! کیا بات تھی؟" مگر کچھ بتانے سے پہلے سمل نے رحیم کو اوپر بلوا کر ان سے زبردست قسم کی ڈانٹ پڑوائی۔ اس کے جانے کے بعد انہوں نے تیسری دفعہ اس سے مسئلہ پوچھا۔

"ڈیڈ!" وہ دھیرے سے بولی۔ "میں آپ کو بتانا چاہتی تھی کہ......"

"کیا؟"

"یہی کہ' میں آپ سے بہت محبت کرتی ہوں نا۔"

اس کی بات سن کر وہ ہنس پڑے۔

"بس یہی کہنے کے لیے تم نے میری بہت ہی اہم میٹنگ میں مداخلت کی؟ میری سیکرٹری کو جاب سے نکلوایا' رحیم کو ڈانٹ پڑوائی' اور مجھے اتنا پریشان کیا؟"

"بالکل!" وہ مسکرائی۔ "کیونکہ اگر میں شیخ جہانگیر کی بیٹی ہوں تو آپ کی میٹنگ سے زیادہ اہم ہوں' میری عزت کرنا آپ کے ملازمین پر لازم ہے اور میرا حکم ٹالنے کا کسی کو اختیار نہیں ہے۔ صحیح کہہ رہی ہوں؟"

جہانگیر نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کے چہرے پر اب بھی وہی معصومیت تھی مگر اس کا لب و لہجہ اور پراعتماد شخصیت پہلے والی سمل کے برعکس تھی۔ کہاں وہ ڈرپوک' کم ہمت' بات بے بات رو پڑنے والی لڑکی اور کہاں آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے والی لڑکی۔

"بالکل صحیح کہہ رہی ہو" انہوں نے مسکرا کر اس کی تائید کی۔

"ڈیڈ! میں اپنی اسٹڈیز مکمل کرنا چاہتی ہوں۔" سمل نے اپنی خواہش ان کے سامنے رکھ دی۔

✡ ✡ ✡

ہسپتال کے اس نیم تاریک کمرے میں اس نے اس رات جو فیصلے کیے تھے' تعلیم مکمل کرنا ان ہی میں سے ایک تھا۔

اب اس نے دوست بھی بنانے شروع کر دیے تھے۔ حماد' فرح' رابعہ' عمران' زیاد' رومیصہ' سب اپر کلاس سے تعلق رکھنے والے اسی کے ہم عمر لڑکے لڑکیاں تھے۔ یہ سمل ہی تھی جس نے ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ جلد ہی وہ سب آپس میں بہت گھل مل گئے تھے۔ ویسے بھی دوستی میں شکل یا جسمانی نقائص اہمیت نہیں رکھتے۔

سمل نے ایک اور کام بھی کیا۔ اس نے اپنی پرانی ڈائریز سے اسکول کے زمانے کے کلاس فیلوز کے ایڈریس اور فون نمبرز نکالے۔ کچھ اسلام آباد کے ہی لڑکے لڑکیاں تھے اور کچھ لڑکیاں Lerrotti School میں اس کے ساتھ پڑھتی تھیں۔ ان میں سے کسی سے بھی اس کی اچھی دوستی نہ تھی' لیکن اس کے باوجود اس نے ان سب کو دوبارہ اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کیا۔

سب سے پہلے اس نے Lerrotti School کی کلاس فیلوز کو خط لکھے۔ کیرولین' ڈینا' کیلی' لوئیس اور فریا احمد سے ہی اس کی کچھ جان پہچان تھی۔ ڈینا کے سوا سب نے جواب دیا' کیونکہ ڈینا جرمنی چلی گئی تھی۔

سمل نے اسلام آباد کے بہت سارے کلاس فیلوز سے رابطہ کیا اور گھر میں گیٹ ٹوگیدر ارینج کر کے انہیں بلایا۔ ان میں سے اکثر آئے تھے' اور یوں وہ ایک دفعہ پھر اچھے دوست بن گئے تھے۔

ایسا سب کچھ سمل نے اس لیے کیا تھا کیونکہ خرم کہتا تھا "تعلقات بنانے سے بنتے ہیں۔ دوست برے وقت کا سہارا ہوتے ہیں۔ تم دوست کیوں نہیں بناتیں؟"

✡ ✡ ✡

فریا احمد کو خط لکھنے کے بیس روز بعد اس کا جواب آیا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

سمل.....

تمہارا خط پڑھ کر اتنی خوشی ہوئی کہ بتا نہیں سکتی۔ تم نے یہ سوچا بھی کیسے کہ میں نے تمہیں بھلا دیا ہو گا؟ بھلا تم بھی کوئی بھلا دینے والی لڑکی ہو؟

میں اپنا فون نمبر لکھ رہی ہوں۔ تم مجھے کال کرنا۔ کیونکہ خط کے ذریعہ بات کرنے کا ذرا مزہ نہیں آتا۔

فون ضرور کرنا۔

فقط

فریا احمد۔

خط پڑھتے ہوئے اس کے لبوں پر بے اختیار ہی ایک مسکان بکھر گئی۔ اسے کئی برس پہلے والی نو عمر فریا یاد آ گئی جس سے زیادہ پوری کلاس میں کوئی خوب صورت لڑکی نہیں تھی۔ سبز آنکھوں والا وہ دلنشین چہرہ یاد کرتے ہوئے سمل کو اپنی کم مائیگی کا احساس بہت شدت سے ہوا تھا۔

اگر وہ خوب صورت ہوتی تو خرم اسے ٹھکرا کر نہ جاتا۔

مگر خرم کا مسئلہ تو دولت تھی حسن نہیں۔

اس نے سر جھٹک کر اس کی یاد کو دل سے نکالنا چاہا اور تپائی پہ دھرا فون اٹھا لیا۔

"ہیلو۔" ایک مردانہ آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔

"ہیلو جی میں فریا سے بات کر سکتی ہوں؟" وہ پراعتماد لہجے میں بولی۔

"فریا؟ ایک منٹ!" مخاطب نے فون منہ سے پرے کر کے کسی کو آواز دی۔ "حیدر' حیدر فری کدھر ہے؟" آواز اتنی اونچی تھی کہ سمل باآسانی سن سکتی تھی۔

"فری آپا؟ وہ میرا خیال ہے بیل بجی تھی' خرم بھائی کو ریسیو کرنے گئی ہیں۔" پیچھے سے ایک آواز ابھری۔ وہ سمجھی اس نے غلط نام سنا ہے۔

"اچھا خرم آ گیا۔" اب ریسیور میز پر رکھ دیا گیا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد فریا لائن پر آ گئی۔ رسمی کلمات' حال احوال اور موسم کی صورت حال بتانے کے بعد سمل نے

اس سے فون اٹھانے والے کی بابت پوچھا۔
"وہ عماد ہوگا۔ ایک منٹ۔" کوئی بدتمیزی تو نہیں کی؟ ویسے یہ ہے بہت شرارتی۔"
"نہیں، نہیں میں نے تو ایسے ہی پوچھا تھا۔ عماد تمہارا؟"

"بھائی ہے۔"
"اچھا خیر تم کیا کر رہی تھیں؟"
"کچن میں تھی مینگو سوفلے بنا رہی تھی۔"
"کس کے لیے؟"
"پورے ٹبر کے لیے۔" فریا ہنسی تھی۔
"تم ابھی تک جوائنٹ فیملی سسٹم میں رہتی ہو؟" سمل کو یاد آیا جب وہ بورڈنگ ہاؤس میں ہوتی تھی تو اکثر اپنی فیملی کے قصے سناتی تھی۔ اس کے دو چچا بمع اپنی فیملیز کے ان کے ساتھ رہتے تھے۔
"ہاں۔"
"پیچھے کس کی آواز آرہی ہے؟"
"یہ صفوان ہے۔ میرا کزن کوئی جوک سنا رہا ہے۔"
"کتنا مزہ آتا ہوگا نا تم لوگوں کو اکٹھے رہتے ہوئے۔ ایک میں ہوں، کوئی بھائی بھی نہیں ہے اور کزنز تو بالکل بھی نہیں ہیں۔ میرے پیرنٹس سنگل چائلڈ تھے۔"
"تمہیں یہ اس لیے اچھا لگ رہا ہے کہ تم تنہا ہوتی ہو۔ سچ پوچھو تو جوائنٹ فیملی سسٹم عذاب ہے۔" فریاد جیسی آواز میں بولی۔
"کیوں شور بہت کرتے ہیں تمہارے کزنز؟ جیسے اس وقت کر رہے ہیں؟" سمل کو بیک گراؤنڈ میں ہونے والا شور واضح سنائی دے رہا تھا۔
"نہیں ویسے تو نہیں کرتے، مگر آج خرم آیا ہوا ہے نا۔"

اس نے بمشکل ریسیور کو تھامے رکھا۔ ظاہر ہے اس دنیا میں ہزاروں خرم ہوں گے۔
"ک۔ کون خرم؟"
"اوہ یار کیا بتاؤں؟" فریا پرجوش لہجے میں بولی۔
"دراصل ہمارے ہوٹل پر کام کرتا ہے۔ اتنا ہینڈسم ہے کہ کیا بتاؤں۔ بالکل مووی اسٹار لگتا ہے۔ آج انکل نے ڈنر پر انوائٹ کیا ہے۔"
"ڈنر؟ تمہارا ڈنر بارہ بجے ہوتا ہے؟" سمل نے شرارت سے بارہ بجاتی گھڑی کو دیکھا۔

"نہیں تو یہاں تو صرف آٹھ بج رہے ہیں۔"
"اوہ..... اچھا ہمارے بارہ ہو رہے ہیں۔" وہ کھلکھلا کر بولی۔
پھر کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ فون بند کر کے وہ سونے کے لیے لیٹ گئی۔ خرم کی یادوں نے پھر سے اسے گھیر لیا تھا۔
"میں اپنے دل کا کیا کروں خرم؟
میں اب بھی، اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی، اپنے ڈاری کو یاد کر کے روتی ہوں۔ اب بھی خرم! تم مجھے یاد آتے ہو۔ مگر میں اس محبت کے خواب نہیں دیکھ سکتی جس کے جگنو تم مجھ سے چھین کر لے گئے ہو، میرے خوابوں کو تعبیر سے پہلے ہی تم نے چکنا چور کر دیا۔"
اس کی آنکھ سے ایک آنسو نکل کر اس کے خوب صورت بالوں میں گم ہو گیا تھا۔



زندگی ایسے ہی گزرتی جا رہی تھی۔ روز و شب ایک جیسے گزر رہے تھے، بس یہی تھی سمل جہانگیر کی زندگی کوئی چھوٹی سے چھوٹی بات بھی اسے خرم کو یاد کرنے پر مجبور کر دیتی، جیسے فریا کے ہوٹل پر کام کرنے والا خرم۔
فریا اکثر اس کا ذکر کرتی اور ہر دفعہ "خرم" کا نام سنتے ہی سمل کا دل ایک دم رک جاتا۔
"کل خرم کے ہوٹل کا افتتاح ہے۔" ایک دن اس نے بتایا۔
"اچھا!" سمل نے جمائی روکی۔ اس کو اس خرم نامی شخص میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔
"بہت پیارا ہوٹل ہے اس کا۔"
"ہوں۔"
"بہت سے نامور صحافی بھی مدعو ہیں۔ دیکھنا کل لیڈز کے اخبارات بھرے ہوں گے اس کے ہوٹل کے ذکر سے۔"

"گڈ۔"
"میں تمہیں تصویریں بھیجوں گی اوکے!"
"اوکے۔" سمل نے شانے اچکا دیے۔
پندرہ بیس روز بعد ہی اسے فریا کا بھاری بھرکم خط ملا۔ خط تو محض تین چار سطروں کا تھا، جن میں اس نے مختصراً "خرم زید" کے ہوٹل کی افتتاحی تقریب کا احوال

لکھا تھا۔ باقی اخبارات کے تراشے اور تصاویر تھیں۔
اس نے سر جھٹکا اور لفافے سے وہ چند تراشے نکالے اور دیکھنے لگی۔

شہ سرخی کے ساتھ لگی تصویر سے سمل اپنی نظریں نہ ہٹا سکی۔
وہ خرم زید تھا۔
اس کی خوشیوں کا قاتل، اس کے خواب توڑنے والا!
تصویر میں اس کا کلوز اپ لیا گیا تھا۔ وہ تھوڑا سا بدل گیا تھا۔ اس کے بالوں کا کٹ مختلف ہو گیا تھا، اور چہرہ پہلے سے کہیں زیادہ پتلا دکھائی دے رہا تھا۔ ڈارک تھری پیس میں اس کی پرسنالٹی بہت ڈیشنگ لگ رہی تھی۔ وہ مسکرا رہا تھا۔
"تو دولت اس کو مل ہی گئی" سمل نے تصویر میں ہوٹل کی پرشکوہ عمارت کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ "وہ بہت جلد ایک بڑا ہوٹلیئر بن جائے گا۔"
سمل نے باقی تصویریں نکالیں۔ یہ سب کیمرہ فوٹوز تھیں۔ فریا، اس کے کزنز اور گھر والوں کے ساتھ خرم کافی انیچ لگ رہا تھا۔
اس نے وہ تمام تصاویر اور تراشے ڈسٹ بن میں پھینک دیے اور اس بات کو بھلانے کی سعی کرنے لگی۔
لیکن کہیں دور اندر، اسے خرم کی کامیابی پر ایک انجانی سی خوشی محسوس ہوئی تھی۔
خرم زید نامی شخص کو بھلانے کی ناکام کوشش کرنے کے باوجود اس نے فریا سے تفصیلاً اس کے بارے میں پوچھا تھا۔
وہ فریا کے والد اور چچاؤں کے ہوٹل پر کام کرتا تھا۔ اس کا ان کے گھر بہت آنا جانا تھا۔ صفوان (فریا کے کزن) اور عماد وغیرہ سے اس کی بہت دوستی تھی۔ شروع شروع میں فریا کے والد اور چچا نے اس کو داماد بنانے کا سوچا تھا، لیکن بعد میں انہیں نے اپنے ارادے کو ترک کر دیا تھا۔ جب سمل نے اس سے پوچھا کہ انہوں نے خرم کو داماد کیوں نہ بنایا تو فریا نہایت خوب صورتی سے بات ٹال گئی۔ سمل کو تجسس ہوا مگر اس نے کرید نامناسب نہیں سمجھا۔



جن دنوں اس نے اپنی تعلیم مکمل کر کے یونیورسٹی کو خیر باد کہا تھا، ان ہی دنوں فریا کی شادی طے ہو گئی۔ اس نے سمل کو بطور خاص انوائٹ کیا تھا، لیکن چونکہ وہ اس بات سے بخوبی آگاہ تھی کہ وہاں خرم بھی ہوگا، اسی لیے ممی کی خرابی طبیعت کا بہانہ کر کے وہ نہیں گئی۔ ویسے بھی ان دنوں وہ شیخ جہانگیر کے ساتھ کام کرنے کی خواہاں تھی جو کام ماہ نور نہیں کر سکی تھی، وہ سمل کر دینا چاہتی تھی۔
"تم میرے ساتھ بزنس میں میرا ہاتھ بٹانا چاہتی ہو؟" وہ حیرت سے پوچھنے لگے۔
"جی۔" وہ سہولت سے بولی۔
"تم کرنا کیا چاہتی ہو؟"
"آپ کے تو ڈھیر سارے بزنس ہیں میں کسی ایک کو۔"

"میری ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کام کرو گی؟"
"نہیں، میں اتنی کری ایٹو نہیں ہوں۔" اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "کچھ اور بتائیں۔"
"آپ تو کہہ رہی تھیں آپ کچھ بھی کر لیں گی؟ اچھا کنسٹرکشن میں آجاؤ"
گو کہ اسے کنسٹرکشن کمپنی کی ایم ڈی بننے میں کوئی دلچسپی نہ تھی مگر اس بار وہ فوراً بولی "بالکل ٹھیک۔"

"جہانگیر بلڈرز" ملک کی اعلیٰ درجے کی تعمیراتی کمپنیوں میں سے ایک تھی۔ لیکن ایم ڈی کی سیٹ سنبھالنے کے ایک روز بعد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ وہاں کوئی بھی اس کو (شیخ جہانگیر کی بیٹی ہونے کے باوجود بھی) باس ماننے پر تیار نہ تھا۔
ان کی نظر میں وہ ایک کم فہم معمولی لڑکی تھی جس کو قسمت نے ان کا حکمران بنا دیا تھا، ورنہ وہ لوگ تو عمر، عقل اور تجربہ میں اس سے کہیں آگے تھے۔ اسے خود کو، اپنی صلاحیتوں کو منوانا تھا۔ تب ہی لوگ اسے تسلیم کرتے۔
اور پھر وہ اپنی اسی لکڑی کی بیساکھی کے سہارے کسی بھی کنسٹرکشن سائٹ، کسی سیمینار یا کسی سکس اسٹار ہوٹل میں ہونے والی بزنس کانفرنس میں بااعتماد طریقے سے شرکت کرتی۔
اس کے آفس کے ایمپلائز اب اس کی عزت کرتے تھے۔ خرم نے ایک دفعہ کہا تھا۔

"انسان اپنی عزت خود کرواتا ہے۔" اب اسے اس بات پر یقین آگیا تھا۔ نجانے کیوں زندگی کی ہر مشکل گھڑی اور ہر سہل لمحے میں وہ شخص اس کی یادوں کے دریچے کھول کر اس کی نگاہوں کے سامنے آجاتا تھا۔ وہ جتنا اس سے' اس کے ذکر سے یا اس کی سوچوں سے بچنے کی کوشش کرتی' اتنا ہی وہ اسے یاد آتا۔

اس کے پروفیسر ایڈم بلیک ویل نے ایک دفعہ کہا تھا "ہم زندگی میں دو لوگوں کو کبھی نہیں بھلا سکتے۔ ایک وہ جو جن کو ہم یاد رکھنا چاہتے ہیں اور ایک وہ جن کو ہم بھلانا چاہتے ہیں۔"

وہ خرم کو بھلانا چاہتی تھی' اسی لیے وہ اس کو نہیں بھولتا تھا۔

کسی نہ کسی بات میں اس کا ذکر آہی جاتا تھا۔ جس طرح اس روز شیخ جہانگیر نے اسے فون کیا تھا۔

"کہاں ہیں آپ ڈیڈ؟"

"میں مانچسٹر میں ہوں۔"

"اچھا؟ مگر آپ تو میونخ میں تھے؟"

"ارے بھئی میں وہاں سے آگیا ہوں۔ اب ادھر ہی ہوں دو ایک روز۔"

"ہوں۔" وہ مصروف لہجے میں بولی۔ اس کے سامنے فائلوں کا ایک انبار تھا جو اسے دیکھنا تھے۔

"میں نے یہاں ایک جگہ دیکھی ہے۔" وہ پُرجوش لہجے میں بتانے لگے۔

"کیوں؟" وہ اب اکاؤنٹس چیک کر رہی تھی۔

"آف کورس ایک شاپنگ پلازہ بنانا ہے۔"

"کیوں؟" اس نے غیر حاضر دماغی سے پوچھا تھا۔

"دوسری شادی کرنی ہے اس لیے!" وہ جھلا کر بولے۔

"اوہ سوری' میں شرکت نہیں کر سکوں گی۔ مجھے یہ بلز دیکھنے ہیں مگر ڈیڈ! مما اور ماہ نور کو بتا دوں؟"

جواب میں ان کا بھرپور قہقہہ سنائی دیا تھا۔

"ویل ڈیڈ! جگہ دیکھ لی ہے تو ڈیل بھی کر لی ہو گی۔ مجھ سے برائے نام مشورے کی وجہ؟"

"میڈم! آپ میری کنسٹرکشن کمپنی پر قبضہ کر کے بیٹھی ہیں۔ آپ سے پوچھ کر ہی کوئی تعمیر ہو گی نا؟"

"بالکل!" اس نے اتفاق کیا تھا۔

پھر وہ دونوں کافی دیر تک تعمیراتی کام کو ڈسکس کرتے رہے۔ انھوں نے بات طے کر لی تھی مگر رقم ابھی ادا کرنا باقی تھی۔

اس رات کام سے فارغ ہو کر اس نے شیخ جہانگیر کو ان کے ہوٹل میں فون کیا۔

"ڈیڈ! اگر آپ کی ڈیل ہو گئی ہو تو میں نے سوچا کہ آئندہ کا لائحہ عمل تیار کریں۔ کیوں ہو گئی ڈیل؟" وہ پوچھنے لگی۔

"بھاڑ میں گئی ڈیل!" وہ کافی غصے میں تھے۔

"کیوں؟" وہ ایکدم سٹپٹا کر بولی۔ "خیریت؟"

"خیریت کہاں ہے؟ میں نے دو ملین قیمت لگائی تھی۔ وہ تین ملین میں لے اڑا۔" وہ تپے ہوئے تھے۔

"وہ کون؟"

"ہے ایک ٹین ایجر تازہ تازہ بزنس کا بخار چڑھا ہے۔ لیڈز میں چند ہوٹلز بنا کر سمجھ بیٹھا ہے کہ مانچسٹر بھی لیڈز ہے۔"

"ٹین ایجر لڑکے نے چند ہوٹلز بنا لیے ہیں؟" وہ حیران سی پوچھنے لگی۔

"ٹین ایجر کہنے کا مطلب ہے وہ ناتجربہ کار ہے اسٹوپڈ!"

"اچھا کون ہے؟" وہ پھر پوچھنے لگی۔

"خرم زید نام ہے اس کا۔"

وہ بری طرح چونکی تھی۔ "اوہ تو اب وہ زمین۔"

"بھاڑ میں گئی زمین۔" ان کا موڈ سخت خراب تھا۔

"اٹس او کے ڈیڈ! کام ڈاؤن۔"

"کام ڈاؤن؟ اس دو ٹکے کے لڑکے نے مجھے اتنی آسانی سے آؤٹ وٹ کر دیا اور تم کہتی ہو کام ڈاؤن؟" وہ اب اس پر غصہ ہو رہے تھے۔

"وہ دو ٹکے کا نہیں ہے" اس نے سوچا۔ خرم کی بے عزتی وہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ مگر اس وقت یہ کہنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔ اسی لیے وہ ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی ہر ممکن سعی کرنے لگی۔

رات کو تمام کام ختم کر کے کرسی پر بیٹھی سمل کو خلاؤں میں گھورتے ہوئے دل ہی دل میں خوشی سی محسوس ہوئی تھی تو خرم اب اتنا آگے نکل چکا تھا کہ وہ شیخ جہانگیر جیسے شخص کو آؤٹ وٹ کرے۔

"واؤ!" اس نے سوچا۔ "میری تو یہی دعا ہے خرم! کہ تمہارا جو بھی مقصد ہو' جو بھی آرزوئیں ہوں' جو بھی خواب ہوں' وہ پورے ہو جائیں۔ اور تمہارے لیے دعا کے علاوہ میں کر ہی کیا سکتی ہوں؟ اور خود اپنے لیے بھی۔



ماہ نور سے اس کی ملاقات زیادہ تر ہوتی ہی نہیں تھی۔ وہ جب آفس میں ہوتی تو بہت مصروف رہتی۔ اور گھر میں ہوتی تو اپنے کمرے یا اسٹڈی کو آفس بنائے رکھتی۔ اس کی روٹین میں باپ کے لیے اور کسی حد تک ماں کے لیے وقت تو تھا مگر بہن کے لیے ایک منٹ نکالنا بھی مشکل تھا۔ آتے جاتے کبھی ہیلو ہائے ہو جاتی۔

لیکن یہ رہا سہا تعلق بھی اس وقت ختم ہو گیا جب ماہ نور نے ایک مشہور راک اسٹار عدیم آفندی سے شادی کر لی۔ شیخ جہانگیر کو اس کا بہت صدمہ ہوا تھا۔ بے شک وہ کسی سے بھی شادی کر لیتی' مگر مشورہ دینا تو باپ کا حق بنتا تھا۔ اس نے تو وہ بھی نہ لیا بس ایک خبر سنائی تھی۔

جہانگیر اس گلوکار کو جانتے تھے۔ اس کو اپنا کیریئر بنانے کے لیے ایک آسامی کی ضرورت تھی۔ اسی لیے ایک امیر آدمی کی بیٹی سے شادی کرنا اس کے لیے کتنا سود مند ثابت ہو سکتا تھا' جہانگیر بخوبی اندازہ کر سکتے تھے۔ وہ حقیقت سے باخبر تھے اسی لیے جب ماہ نور اپنے شوہر کے ہمراہ "جہانگیر پیلس" میں داخل ہوئی تو انہوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"ماہ نور......! آج سے میرا اور تمہارا تعلق ختم ہو گیا ہے۔ میرے ساتھ ساتھ اس گھر سے بھی تمہارا تعلق ختم ہو چکا ہے۔ تم اس گھر سے کپڑوں اور جوتوں کے علاوہ ایک پیسہ بھی نہیں لے کر جا سکتیں۔ اپنی جائیداد اور کاروبار میں سے تمہارا حصہ میں ختم کر چکا ہوں۔ کل کے اخبارات کے مطابق میں تمہیں اپنی منقولہ اور غیر منقولہ جائیداد سے عاق کر چکا ہوں گا۔ میرا اب سب کچھ سمل کے نام ہے۔ میری وصیت کے مطابق بھی تمہارا کسی چیز پر کوئی حق نہیں ہو گا اور چونکہ میری جائیداد موروثی نہیں ہے' اسی لیے تم میری وصیت کو کسی بھی عدالت میں چیلنج نہیں کر سکو گی' اور اگر تم نے کبھی بھی خاندان کے نام کو خراب کرنے کی کوشش کی' یا کوئی الٹی سیدھی بات میڈیا کے سامنے کی تو میرے دل میں اگر تمہارے لیے کوئی تھوڑی بہت جگہ باقی بچ بھی گئی ہے' تو وہ بھی ختم ہو جائے گی اور بیٹا! مجھے معلوم ہے کہ تم میری دشمنی مول لینے کا رسک نہیں لو گی! اب تم اپنا ضروری سامان لو اور جاؤ۔" وہ جانے کے لیے مڑے مگر پھر کسی خیال کے تحت رک کر بولے "اینڈ ریممبر! نو کرنسی اینڈ نو جیولری۔"

اتنا کہہ کر وہ اپنی اسٹڈی کی طرف بڑھ گئے۔

سیڑھیوں کے قریب کھڑی سمل نے غور سے ماہ نور کا زرد پڑتا چہرہ دیکھا۔ "جب خرم کی بات تھی تو وہ شرائط رکھنے کا کہتی تھی۔" اس نے سوچا۔ اور اب عدیم کے معاملے میں اس نے کوئی شرط نہ رکھی عدیم سے بہتر تو خرم تھا۔ لالچی سہی مگر عزت کے ساتھ مجھ سے شادی تو کرتا نا کہ ماہ نور کی طرح کورٹ میرج کی رسوائی اٹھانا پڑتی۔ کیا عدیم کو دیکھ کر ماہ نور کی وہ "حس" جس سے وہ لوگوں کے "لالچ" کا اندازہ لگا لیتی تھی ایک دم ختم ہو گئی تھی؟ کیا اس کو اتنی بھی سمجھ نہیں آئی تھی کہ وہ ڈیڈ کے ٹکڑوں پر پلنا چاہتا ہے۔ اگر اس وقت ماہ نور کو ایسا کچھ دکھائی نہ دیا تھا تو میری باری پر اسے خرم میں کیسے "لالچ" نظر آیا تھا۔

وہ اپنی بیساکھی کے سہارے چلتے ہوئے ان دونوں کے قریب آئی۔

ماہ نور نے سر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ اب دولت کی کنجی اس کے پاس تھی۔ سو وہ ایک دم کھڑی ہو گئی۔

"سمل! پلیز ڈیڈ کو سمجھاؤ۔ وہ یہ فضول کی ضد چھوڑ دیں ان کی دولت میری بھی ہے' اور اگر میری ہے تو اس پر عدیم کا حق بھی تو بنتا ہے نا! وہ کیوں اس طرح......"

"ایک منٹ!" سمل نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔

"ایک منٹ ٹھہرو نور! جب خرم کا "میری" دولت پر کوئی حق نہ تھا تو بھلا عدیم کا اس جائیداد پر کیا حق؟ اگر خرم لالچی تھا تو عدیم کتنا قناعت پسند بلکہ غیرت مند ہے؟"

عدیم کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ وہ کچھ کہہ اس لیے نہیں سکتا تھا کیونکہ اب تمام دولت کی وارث سمل تھی۔

"سمل......" ماہ نور منمنائی۔

"نور!" وہ چبا چبا کر بولی۔ "تمہارا ڈیڈ کی دولت' بلکہ میری دولت پر کوئی حق نہیں ہے۔ اب جس طرح ڈیڈ نے کہا تھا کہ اپنا سامان اٹھاؤ اور چلی جاؤ یہاں سے۔ اسی طرح اب تم یہاں سے چلی جاؤ۔" وہ کہہ کر پلٹی۔

"سمل! تم میرے لیے کچھ نہیں کر سکتیں؟"

سمل نے مڑ کر اسے دیکھا۔ "میں؟" وہ تمسخر سے ہنسی تھی۔

"ہاں' دیکھو کس لیے ہے یہ دولت' اگر ہم دونوں بہنوں کو فائدہ نہ پہنچے تو پھر......" ماہ نور بے چارگی کے عالم میں کہہ رہی تھی۔

"فائدہ کیوں نہ پہنچے؟ تم نے اٹھایا ہے نا فائدہ ساری زندگی! اب اور کیا چاہتی ہو؟" وہ اس کی بات کاٹ کر بولی۔
"لیکن میں شاید تمہارے لیے تھوڑا بہت تو کر سکتی ہوں۔" سمل نے اپنا پرس کھولا اور ہزار ہزار کے بیس نوٹ نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔
"یہ تمہارے ہزبینڈ کی منتھلی انکم سے تو زیادہ ہی ہوں گے اور پلیز آئندہ مجھے تنگ مت کرنا۔"
اتنا کہہ کر وہ رکی نہیں تھی۔ اسے ماہ نور کو بے عزت کرنے اور اپنی فتح کی کوئی خوشی نہ تھی۔ اس کو معلوم تھا جس طرح وہ پژمردگی کے عالم میں اپنے کمرے میں بند بیٹھی تھی 'اسی طرح اس کا بوڑھا باپ بھی نم آنکھوں کے ساتھ اپنی اسٹڈی میں تنہا بیٹھا ہوگا۔
اگلی صبح ڈائننگ ہال میں ناشتے پر سمل اور شیخ جہانگیر ایک دوسرے سے بالکل نارمل انداز میں ملے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔
اور واقعی۔ ان کے ساتھ تو کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔
جو کچھ ہوا تھا ماہ نور کے ساتھ ہوا تھا......



"مکار چڑیل! کتنا ڈھونگ رچایا تھا بے بسی اور معصومیت کا اس نے۔ سب کو اپنے چنگل میں پھنسالیا اور میں سمجھتی رہی 'وہ لولی لنگڑی بے ضرر ہے۔ وہ بزنس میں ڈیڈ کا ہاتھ بٹانے لگی 'میں پھر بھی محتاط نہ ہوئی سب کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی اس نے۔ یہی چاہتی تھی نا سمل کہ میں اپنے گھر سے بے دخل ہو جاؤں۔ ڈیڈ کی دولت میں میرا کوئی حصہ نہ رہے اور دیکھو جو اس لومڑی نے چاہا وہ ہو بھی گیا۔ اسے پڑھنے کے لیے یو کے بھجوایا اور مجھے اسلام آباد میں ہی رکھا۔ اس کو اتنی بڑی لائبریری بنوا کر دی اور مجھے...... ہونہہ کتنا شوق تھا مجھے میوزک کا مگر بزنس پڑھنے پر لگا دیا اور اسے...... جب اس کا دل چاہا اس نے پڑھائی چھوڑ دی۔ تب ڈیڈ نے کچھ نہیں کہا انہیں صرف میری پڑھائی کا سو کالڈ حرج دکھائی دیتا تھا اور 'اور اس پر خواہ مخواہ ہی اتنا ہینڈسم بندہ عاشق ہو گیا۔ مجھے تو آج تک اتنا ڈیشنگ پارٹنر نہیں ملا۔" ماہ نور کیتھیڈرل کی پتھریلی دیوار سے کمر ٹکائے سوچ رہی تھی۔
"یہ تو اچھا ہوا سمل نے میری بات مانتے ہوئے خرم کو چھوڑ دیا۔ لیکن کیا فائدہ ہوا؟ خرم سے شادی کی صورت میں اسے آدھی جائیداد ملتی اور اب 'اب تو وہ پوری ہتھیا بیٹھی ہے جبکہ میں 'میں ادھر لاوارثوں کی طرح بھٹک رہی ہوں۔ اب تو رسل بھی چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ میرے پاس تو کوئی اپارٹمنٹ بھی نہیں ہے رہنے کو۔ کہاں میں ادھر لندن میں کوئین الزبتھ روڈ پر ڈیڈ کے پینٹ ہاؤس میں رہتی تھی۔ جس میں بیس کمرے تھے اور کہاں میرے پاس ڈنر کے لیے بھی پیسے نہیں ہیں۔ کتنا بدل گیا ہے ناوقت کیوں؟ کیوں ملا اس کو وہ سب اور میں 'میں......"
اس کی سوچ میں مخل ہونے والی آواز بہت جانی پہچانی تھی۔
"ماہ نور!" کوئی اسے پکار رہا تھا۔ اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ اور مبہوت رہ گئی۔ وہ خرم تھا۔
"آ' آپ؟" وہ حیران سی ہو کر اسے دیکھے گئی۔ وہ تو اتنا غریب تھا۔ پھر بھلا لندن کیسے پہنچ گیا؟
"ہاں میں خرم!" وہ اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔
"آپ ادھر کیا کر رہے ہیں؟" (یقیناً غیر قانونی طور پر آیا ہوگا۔)
"میں ادھر ہی ہوتا ہوں۔" خرم نے جواب دیا۔
"لندن میں؟" (کہہ تو ایسے رہا ہے جیسے نیشنل ہو گیا پتہ ہو بھی!)
"نہیں مانچسٹر میں۔" وہ بتانے لگا۔
"کیسے ہیں آپ؟" وہ پوچھنے لگی۔
"میں ٹھیک ہوں 'سمل کیسی ہے؟" وہ بے چینی سے پوچھنے لگا۔
"جی؟" وہ حیرانی سے اسے دیکھنے لگی۔ (یہ اسٹوپڈ سمل کا حال مجھ سے کیوں پوچھ رہا ہے؟ اسے نہیں معلوم کہ ڈیڈ نے مجھے عاق کر دیا ہے؟)
"سمل کیسی ہے؟" وہ پھر پوچھنے لگا۔
"آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ سمل کیسی ہے؟" (الو! مجھے کیا پتہ وہ کیسی ہے؟)
"ہاں 'تم اس کی بہن ہو اس کے ساتھ رہتی ہو تم ہی سے پوچھوں گا۔"
(ہیں! اسے نہیں معلوم کہ میں اب اس کے ساتھ نہیں رہتی؟ میں تو پچھلے سات ماہ سے اس سے نہیں ملی پھر یہ اس طرح کیوں پی ہو کر رہا ہے؟)
"آپ کو' آپ کو کچھ نہیں پتہ؟" اب وہ کیسے بتاتی کہ شیخ جہانگیر نے اسے گھر سے نکال دیا ہے۔
"کیا نہیں پتہ؟" وہ پریشان ہو گیا تھا۔ (یہی کہ میں اس کے ساتھ نہیں رہتی ایڈیٹ)
"آپ سمل سے آخری بار کب ملے تھے؟" (اگر سات ماہ سے نہیں ملا تو پھر اسے کچھ پتا نہیں ہوگا)
"جب اس نے مجھے گھر بلایا تھا۔ 17 مارچ تھی!" وہ بولا۔
"اوہ۔" اس کے منہ سے بے اختیار نکلا (تو کیا واقعی سمل نے اس کو چھوڑ دیا تھا۔ کتنی ایڈیٹ ہے نا سمل! اتنے ہینڈسم بندے کو چھوڑ دیا۔ بے وقوف نہ ہو تو۔ خیر اتنی بے وقوف تو نہیں ہے ڈیڈ کی پوری دولت ہتھیالی ہے۔ ہونہہ......)
"یعنی آپ کو کچھ نہیں معلوم۔" وہ بولی۔
"نہیں' نور! پلیز بتاؤ نا! کیا ہوا سمل کو؟" وہ ایک دم گھبرا گیا تھا۔
اس کی اس بات پر وہ حیران رہ گئی۔ یعنی اس کے خیال میں سمل کو کچھ ہوا تھا۔ اس کے جانے کے بعد سمل نے خودکشی کی کوشش کی تھی اور ایک دم نور کے ذہن میں ایک خیال آیا تھا۔ اس نے نا محسوس طریقے سے خرم کا جائزہ لیا۔ اس کے کپڑے تو اچھے خاصے تھے۔ یقیناً "بہت منگے ہوں گے اور جیکٹ غالباً "مارکس اینڈ اسپنسر" کی تھی (واؤ یہ تو کافی امیر ہو گیا ہے۔ ایک اچھا سا اپارٹمنٹ بھی ہوگا اس کے پاس۔ مجھے فی الحال یہی چاہیے۔ ٹھیک ہے۔ بس ایک دفعہ اس کے دماغ سے وہ لنگڑی چڑیل نکل جائے نا۔ باقی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ سمجھ رہا ہے سمل کو کچھ ہوا ہے۔ سمل نے خودکشی کی تھی اگر...... اگر میں یہ کہہ دوں کہ وہ مر گئی ہے تو؟)
"آپ اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔" ماہ نور نے بات کا آغاز کیا وہ بہت دلبرداشتہ تھی۔ اس سے آپ کی بے وفائی برداشت نہ ہو سکی اور اس نے......" وہ اب آنکھوں میں آنسو لانے کی کوشش کر رہی تھی۔
"کیا کیا اس نے بتاؤ نا نور!" وہ زور سے چیخا تھا۔
"آپ کے جانے کے فوراً بعد سمل نے...... سمل نے خودکشی کر لی۔" "اس کو مرے ہوئے تین سال سے اوپر ہو گیا ہے۔" (اور مجھے سات ماہ ہو گئے ہیں زندہ درگور ہوئے) اس کو ہم سب نے بہت دکھ دیے تھے میں نے بہت برا کیا تھا اس کے ساتھ (اور اس کا حساب سمل نے ان چند ہزار کی ذلت میں چکا دیا جو اس روز اس نے مجھے دیے تھے) اور اور آپ نے بھی بہت برا کیا تھا (ہاں تم نے اس کو پسند کر کے بہت غلط کیا تھا۔ میرے ہوتے ہوئے بھی اس چڑیل سے محبت۔ اف پتہ نہیں تمہاری عقل کہاں تھی) آپ اس کو چھوڑ کر چلے گئے تھے (بہت اچھا کیا بلکہ اچھا نہیں کیا۔ تمہاری اس سے شادی ہو جاتی تو کم از کم آدھی دولت تو مجھے ملتی۔ اب تو وہ پوری ہتھیا چکی ہے) ساری زندگی اس کے ساتھ زیادتی ہوتی رہی (یہی بات وہ بڑی معصومیت سے ڈیڈ سے کہتی ہوگی تب ہی تو پوری دولت پر سانپ بن کر بیٹھ گئی ہے) اب وہ اور کیا کرتی؟ (سوائے ہر چیز پر قبضہ کرنے کے) ڈیڈیا ممانے کبھی اس کو بیٹی نہ سمجھا تھا (شہزادی سمجھا تھا) حالانکہ وہی اچھی بیٹی تھی (ڈیڈ کے خیال میں۔)
ماہ نور اب اپنی حالت کا سوچ کر رونے لگی تھی۔ اس نے خرم کے چہرے پر زلزلے کے آثار دیکھے تھے۔
"تھوڑا سا شاک ہے۔ جلد ہی ری کور کر لے گا۔ پھر یہ میرا ہوگا۔" اس نے سوچا تھا۔
"تم یہاں کیا کر رہی تھیں؟" کافی دیر کی چھائی ہوئی خاموشی کو خرم نے توڑا تھا۔
"میں 'میں بہت ڈیپریسڈ تھی۔ اس لیے ادھر آگئی۔" ماہ نور اب اپنے آنسو روک رہی تھی (اف! میں اتنی اچھی ایکٹریس ہوں۔ مجھے تو پتہ ہی نہیں تھا۔ ڈیڈ نے بھی مجھے بزنس پڑھنے پر لگا دیا اگر میں لاس اینجلس چلی جاتی تو ہالی وڈ کی ٹاپ کی ایکٹریس بن جاتی۔ مجھے پہلے خیال آجاتا تو کتنا اچھا تھا)" اسے نئے افسوس نے گھیر لیا۔
"آپ پاکستان سے کب آئے؟"
"97ء کے مئی میں۔" خرم نے کہا۔
"یہ تو فوراً' ہی بھاگ آیا۔" ماہ نور نے سوچا۔
"اس کے بعد واپس نہیں گئے؟"
"نہیں۔" خرم نے آہستہ سے کہا تھا۔
"باہر چلیں؟" ماہ نور اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ تو اور بھی کچھ کہنا چاہتی تھی مگر فی الحال اسے دکھی ہیروئن کا رول کرنا تھا' اسی لیے پژمردہ سی شکل بنا کر اس کے ساتھ باہر آگئی۔ ایک دم اسے لگا کہ وہ پیچھے رہ گیا ہے۔ ماہ نور نے مڑ کر اس کی جانب دیکھا تو وہ بولا۔
"میری بہن اندر ہے۔ تم جاؤ میں بعد میں جاؤں گا۔"
ماہ نور نے اثبات میں سر ہلا دیا اور پارکنگ ایریا کی طرف بڑھ گئی۔ وہ وہاں کھڑے ہو کر خرم کا انتظار کرنے لگی۔ اس

سے کچھ دور ہی ایک ریڈ بی ایم ڈبلیو کھڑی تھی جو شخص اس کا دروازہ آدھا کھولے کھڑا تھا اس کی ماہ نور کی طرف پشت تھی۔ وہ موبائل پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ ایک دم ہی وہ اس کی طرف مڑا تھا۔ ماہ نور کو ایک جھٹکا لگا تھا۔

وہ گیری تھا۔ گیری مک کوئین وہ اویپر ایپانسٹ تھا۔ اس سے زبردست پیانسٹ پورے امریکہ میں کوئی نہیں تھا۔ ایک دفعہ جب وہ عدیم کے ساتھ فارن ٹور پر امریکہ گئی تھی تو لاس ویگاس میں وہ گیری سے ملی تھی۔ اس وقت وہ عدیم کی محبت میں اتنی گرفتار تھی کہ اسے گیری کی نگاہوں میں اپنے لیے پسندیدگی دکھائی نہیں دی تھی۔ اس نے سنا تھا وہ غیر شادی شدہ ہے۔ اس وقت بھی وہ اکیلا تھا۔

ماہ نور نے ایک نظر اپنے پیچھے موجود لش گرین گھاس والے وسیع و عریض گراؤنڈ پر ڈالی جہاں خرم زید تھا۔ وہ شکل میں گیری سے لاکھ درجے اچھا تھا مگر اس کو اندازہ تھا کہ گیری مک کوئین بے تحاشا دولت کا مالک ہے دوسرے خرم کو وہ پہلے بھی اتنی خاص پسند نہیں تھی۔ اگر اب وہ اسے نہیں ملتا تو اس طرح تو وہ بالکل تہی دست رہ جاتی۔ جبکہ گیری کے معاملے میں اسے زیادہ فائدہ نظر آ رہا تھا۔ کچھ دیر وہ کھڑی رہی اور بالآخر یہ سوچتے ہوئے کہ اگر گیری نے نہ پہچانا تو وہ خرم کے لیے ٹرائی کرے گی' وہ ریڈ بی ایم ڈبلیو کی طرف بڑھ گئی۔

گیری مک کوئین نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ڈیڈ! یہ ہوٹل کتنا زبردست ہے۔" فورک کی مدد سے ماکرونیز منہ میں رکھتے ہوئے بے اختیار اس نے شیخ جہانگیر سے پوچھا۔ "پتہ تو کریں کس کا ہے۔"

"ایک پاکستانی بزنس مین کا ہے۔" انھوں نے اخبار پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ سمل کے ذہن میں فوراً ایک نام آیا تھا۔

"واؤ' مجھے نہیں پتا تھا کہ پاکستانیوں کے دوبئی میں بھی ہوٹلز ہوتے ہیں۔" وہ بظاہر لاپروائی سے بولی۔ "ویسے ہے کس کا؟"

"تمہاری ایک فرینڈ تھی فریال تم نے ایک دفعہ بتایا تھا۔ اس کے ابو کا ہوٹل ہے۔ وہ جو لیڈز میں رہتے ہیں۔"

سمل کے جذبات پر اوس پڑ گئی۔

"کون سی فرینڈ سمل؟" مما کے پوچھنے پر اس نے ان کی طرف دیکھا۔

"میری کلاس فیلو تھی مما! لیڈز میں رہتی تھی۔ اب تو شادی ہو گئی ہے اس کی' آج کل فرانس میں ہوتی ہے۔" وہ بتانے لگی۔

"دیکھو سمل! تمہارے ساتھ کی ہر لڑکی کی شادی ہو گئی ہے اور ایک تم ہو کہ خوامخواہ اس بزنس کے بکھیڑوں میں الجھی ہوئی ہو۔" مما روایتی ماؤں والے انداز میں اس سے مخاطب تھیں۔ "بس بہت ہو گیا۔ تمہارا باپ تو ہے ہی بزنس مین اس کو تمہاری ذرا فکر نہیں ہے مگر تم تو سمجھ دار ہو۔ اپنی زندگی کو یوں ان فضول کاموں میں مت الجھاؤ۔"

سمل نے بچاؤ کے لیے باپ کی جانب دیکھا مگر وہ ایک دفعہ پھر اخبار میں غرق ہو چکے تھے۔

"مما پلیز!" وہ تحمل سے بولی۔ "آپ کیوں میری شادی کی فکر کرتی ہیں؟ میں لنگڑی ہوں اور میرا نہیں خیال کہ لنگڑی لڑکیوں سے کوئی بخوشی شادی پر رضامند ہو جاتا ہے۔" نہایت تلخی سے کہے گئے ان الفاظ پر بھی شیخ جہانگیر نے سر نہیں اٹھایا تھا۔

"لیکن سمل! حقیقت یہ نہیں ہے۔" مما تیز لہجے میں بولیں۔ "حقیقت تو اس سے مختلف ہے۔"

"کیا مطلب؟" وہ اب کے حیران سی ہو کر ماں کا چہرہ دیکھنے لگی۔

کافی عرصہ پہلے ایک لڑکا تم میں انٹرسٹڈ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ تم نے اسے انکار کر دیا۔" ان کی بات پر سمل تو اپنی جگہ ساکت ہو ہی گئی مگر شیخ جہانگیر بھی یک دم چونکے تھے۔

"کون سا لڑکا؟" وہ پوچھنے لگے۔

"پ' پتہ نہیں۔ مجھے تو نہیں پتا۔" وہ گھبرا کر جلدی سے بولی۔

"کس کی بات کر رہی ہو؟" وہ اب بیوی سے پوچھ رہے تھے۔

"ایک لڑکا تھا۔" وہ اب ان کی جانب رخ کیے بتا رہی تھیں۔ "کئی بار سمل کے ساتھ گھر بھی آیا۔ اس کے انداز سے لگتا تھا وہ سمل کو پسند کرتا ہے۔ وہ تھا بھی بہت اچھا! بہت اسمارٹ' بہت ہینڈسم' میں نے ماہ نور سے پوچھا تھا ایک دفعہ۔ اس نے بتایا کہ یہ لڑکا سمل کو پسند کرتا ہے۔"

"وہ' وہ لالچی تھا۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"تمہیں کیسے پتہ؟" جہانگیر اب تفتیشی موڈ میں تھے۔

"اس نے کہا تھا؟"

"مجھے' مجھے نور نے کہا تھا۔" وہ بالآخر سچ بول ہی گئی۔

"تمہیں نور نے کہا تھا؟" وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہے تھے "سمل! تمہیں نور نے یہ سب کچھ کہہ دیا اور تم نے یقین کر لیا؟"

"لیکن جہانگیر! نور نے مجھے بتایا تھا وہ لڑکا سمل کے ساتھ بالکل فیئر تھا مگر سمل نے اسے چھوڑ دیا۔" مما حیرانی سے بولیں۔

"تم یہ سب کچھ مجھے اب کیوں بتا رہی ہو؟" وہ اب اپنی بیگم سے مخاطب تھے۔ "پہلے کیوں نہ بتایا؟"

"میں اسی لیے خاموش رہی کہ شاید یہ ہی کچھ بتا دے مگر اب مجھے ہی اس کی شادی کی فکر کرنی ہے۔"

"اب کہاں ہے وہ لڑکا؟" وہ اب اس سے مخاطب تھے۔

"پتہ نہیں۔ میں تو پچھلے پانچ برسوں سے اس سے نہیں ملی۔" اس نے شانے اچکا دیے۔ "ویسے بھی ہمارا بریک اپ ہو گیا تھا۔"

"پوچھ سکتا ہوں کیوں؟"

"میں نے بتایا نا کہ وہ لالچی....."

"یہ بات تمہیں نور نے بتائی تھی۔ تم مجھے وہ بتاؤ جو....."

"عمران کی بات مکمل نہیں ہو سکی۔

"زہے نصیب! بڑے لوگ آئے ہوئے ہیں۔" ایک شوخ سی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ایک ینگ اور اسمارٹ سا لڑکا غالباً" شیخ جہانگیر سے مخاطب تھا۔

"بڑے لوگ چھوٹے لوگوں کو ہی دیکھ رہے تھے۔" شیخ جہانگیر بھی خوشگوار موڈ میں بولے۔ وہ ہنستے ہوئے آگے بڑھا اور ان سے مصافحہ کیا۔

"ویسے مجھے معلوم ہے کہ میں بہت گڈ لکنگ ہوں۔ اسی لیے مجھے اتنے شوق سے دیکھنے کے بجائے آپ کوئی سلام دعا ہی کر لیتے۔" وہ ان کے کہنے پر ان کے برابر ہی کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

"سلام کرنا بھی تمہارا کام تھا اور رہی دعا۔" وہ مسکرائے "تو وہ بھی تم ہی دے دو۔"

"اوکے!" اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ "اناللہ وانا الیہ راجعون۔" اس نے ہاتھ گرا دیے۔ "اچھی دعا تھی نا؟" وہ معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

"یو ایڈیٹ!" وہ ہنستے ہوئے بولے۔ "خیر چھوڑو یہ میری وائف ہیں سلمیٰ اور یہ میری بہت پیاری اور اچھی بیٹی ہے سمل"

"آداب آنٹی!" وہ فوراً" بولا۔ "اور آپ کو بھی سلام مس جہانگیر۔"

"سلمیٰ! سمل! یہ میرا دوست ہے۔ جوانی کے زمانے سے۔" وہ کہہ رہے تھے۔ سمل نے حیرانی سے اس بمشکل اکیس یا بائیس سالہ لڑکے کو دیکھا۔

"حیران نہ ہو۔ مس!" وہ فوراً" بولا۔ "یہ اپنی نہیں میری جوانی کی بات کر رہے ہیں۔ ان کی جوانی تو دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں ہو گی۔" وہ جان بوجھ کر آخری فقرہ آہستہ سے بولا تھا مگر انسوں نے پھر بھی سن لیا تھا تب ہی فوراً" بولے۔

"میں آج بھی تم سے زیادہ ہینڈسم ہوں مسٹر! اور یہ میرا ڈھائی دن پرانا دوست ہے۔" وہ اب سمل سے مخاطب تھے۔ "تمہاری فرینڈ فریال ہے نا۔ اس کا چھوٹا بھائی ہے۔"

"عماد؟"

"جی۔" اس نے سر کو ہلکا سا خم دیا۔

"میں اس سے پرسوں ملا تھا۔" وہ بتا رہے تھے۔

"اس وقت یہ اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ ڈنر کر رہے تھے۔" عماد نے دھیرے سے سمل سے کہا۔ "میں نے ڈنر اپنی فیملی کے ساتھ کیا تھا۔ تم سے تو میں صبح ملا تھا!"

"اوہ اچھا۔" وہ کچھ کھسیانا سا ہو کر بولا۔

"اور کام کیسا جا رہا ہے؟" وہ پوچھنے لگے۔

"اوہ سر کچھ نہ پوچھیں۔" عماد نے ایک دم مسکین سی شکل بنالی۔ "میرے ابا نے مجھ غریب کو یہاں جھک مارنے بھیج دیا ہے۔ دن رات کام کرتا ہوں پھر بھی ڈانٹتے ہی رہتے ہیں۔ اب خود ہی دیکھیں نا! چھٹیاں عیش کرنے کے لیے ہوتی ہیں یا کام کرنے کے لیے؟"

"کام کرنے کے لیے!" سمل فوراً" بولی۔

"اوہ رئیلی! پھر آپ میرا سارا کام کر دیں میں دل کی تہہ سے آپ کا مشکور رہوں گا۔"

"عماد' تہہ دل سے ہوتا ہے اور شکور نہیں مشکور ہوتا ہے۔" شیخ جہانگیر نے فوراً" لقمہ دیا۔

سمل نے اتنا حاضر جواب اور ہنس مکھ بندہ آج تک نہیں دیکھا تھا۔ جتنی دیر وہ ان کے پاس بیٹھا رہا وہ ہنستی ہی رہی۔ عماد کی گفتگو ہی اتنی دلچسپ ہوتی تھی۔

"چائے پیو گے؟" سمل چائے کا آرڈر دینے کے بعد

اس سے پوچھنے لگی۔

"ظاہر ہے آپ کے پوچھنے پر میں تکلفاً" انکار کروں گا۔ پھر آپ اصرار کریں گی تو میں "ہاں" کروں گا، چلیں ایک کپ سہی اسی لیے پوچھ رہی ہیں آپ؟"

"نہیں تو، تم بھی نابات کو کہاں سے کہاں لے جاتے ہو۔"

"ویسے میں چائے کے ساتھ ساتھ کھانا بھی کھاؤں گا۔ بلکہ اگر آپ مجھے شاپنگ پر لے جائیں گی تو پورا ٹاؤن سینٹر خرید لوں گا۔ تکلف مت کیجئے گا سمل! آپ مجھے دبئی کے ہر ریسٹورنٹ کا کھانا کھلا سکتی ہیں، میں بالکل برا نہیں مانوں گا۔ بشرطیکہ بل آپ دیں گی لیکن۔" اس نے گھڑی دیکھی "ابھی نہیں ابھی مجھے بہت کام کرنا ہے پھر کبھی۔ اوکے اب میں چلتا ہوں۔" وہ اتنا کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ جاتے جاتے اس نے یہ کہہ کر سمل سے اس کا موبائل نمبر لے لیا کہ "میں تمہیں کال کروں گا۔" سمل اور شیخ جہانگیر بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ سمل کا خیال تھا وہ اس کی بیساکھی دیکھ کر حیران ہوگا مگر عماد کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں تھا۔

وہ چلا گیا تو جہانگیر نے چائے اوپر کمرے میں لانے کا آرڈر دیا اور سمل کے ساتھ اپنے سوٹ میں واپس چلے گئے جبکہ سلمٰی تو پہلے ہی شاپنگ کی غرض سے وہاں سے جا چکی تھیں۔

لگژری سوٹ کے سٹنگ روم میں جب وہ دونوں بیٹھ گئے تو شیخ جہانگیر عماد کے بارے میں بات کرنے لگے۔

"اچھا لڑکا ہے۔"

"مگر تیز بہت ہے۔" سمل نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

"وہ تو ہے۔" وہ ہنسنے لگے۔

"فریا کہتی تھی ایک ہزار شیطان مرے تھے تو عماد پیدا ہوا تھا۔" وہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ چائے آگئی۔ اس نے دو پیالیاں سیٹ کیں اور قہوہ ڈالنے لگی۔

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی تو انہوں نے بجائے ریسیور کان سے لگانے کے اسپیکر آن کر دیا۔

"سر! آپ کے لیے مانچسٹر سے کال ہے۔" سمل نے پیالیوں میں دودھ انڈیلتے ہوئے آپریٹر کی آواز سنی۔

"ہاں ملاؤ۔" وہ بولے۔

اس نے چینی مکس کی۔

"جہانگیر اسپیکنگ۔" وہ سلسلہ ملنے پر بولے۔

"میں خرم بات کر رہا ہوں۔" اسپیکر میں سے آواز ابھری۔ "خرم زید!"

سمل کے ہاتھ سے پیالی چھوٹ گئی۔ شیخ جہانگیر نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا مگر وہ اتنی ہی شاکڈ نگاہوں سے ان کو دیکھ رہی تھی۔

"کون خرم زید؟" وہ شاید پہچان نہیں پائے تھے مگر سمل اس آواز کو کیسے بھلا سکتی تھی۔

"وہی خرم زید جس نے مانچسٹر میں ونسلو روڈ والی زمین آپ کے ہاتھوں سے چھینی تھی۔" جہانگیر نے اس کی طرف دیکھ کر شانے اچکا دیے۔ "ہوں..... پھر؟"

"پھر یہ مسٹر جہانگیر! کہ بزنس میں رقابت ہے مگر دھوکا نہیں۔" ادھر سے دانت پیس کر کہا گیا تھا۔

"میں نے کسی کے ساتھ دھوکہ نہیں کیا زید! تمہیں وہ زمین چاہیے تھی سو مل گئی۔ میں تو اس بات کو بھول بھی چکا تھا۔" جہانگیر آرام سے بولے۔

"اینلا ٹیک پینل اینڈ گلاس کمپنی آپ کی ہے؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"آں ہاں، کیوں؟" وہ ایک دم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

"آپ اس کو دھوکا نہیں سمجھتے مگر میرے نزدیک غلط مال سپلائی کرنا دھوکہ ہی ہے۔" اس نے کھٹاک سے فون رکھ دیا تھا۔ اس نے صدمے اور دکھ سے اپنے عزیز باپ کو دیکھا۔

"آپ نے اس کو غلط مال سپلائی کیا تھا؟" وہ بولی تو اس کی آواز میں گہرے دکھ کی پرچھائیاں تھیں۔

"نہیں، دماغ خراب ہو گیا اس لڑکے کا۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور بے چینی سے کمرے میں ٹہلنے لگے۔

"آپ نے کوئی دھوکا کیا ہے اس کے ساتھ؟" وہ دھیرے سے بولی۔

"نہیں! مجھے تو ابھی پتہ چلا ہے کہ ہم نے اسے مال سپلائی کیا ہے۔ ایک منٹ۔" انہوں نے اپنا موبائل نکالا اور کوئی نمبر پنچ کرنے لگے۔ پھر وہ فون کان سے لگائے باہر نکل گئے۔

سمل نے ایک نگاہ ان کی ٹھنڈی ہوتی چائے پر ڈالی اور ایک اپنے قدموں کے قریب گری پیالی پر، پیالی بہت نازک تھی اسی لیے انتہائی نرم قالین ہونے کے باوجود بھی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ بس اپنے جوتوں کو ہی دیکھتی رہی۔ تقریباً پانچ برس سے اوپر ہو گیا تھا خرم کو دیکھے ہوئے اور اس کی آواز سنے ہوئے اور اب، اب اس نے اس کی آواز سنی

بالکل ایسے جیسے وہ اس کے قریب ہو، بہت قریب......



"ٹاؤن سینٹر" میں اس پرفیوم کی شاپ پر آدھا گھنٹہ مغز ماری کے بعد اسے اپنا مطلوبہ پرفیوم ملا تھا۔ اس نے اسے پیک کروایا اور قیمت ادا کرنے کے لیے پرس میں ہاتھ ڈالا مگر یہ اتفاق ہی تھا کہ اندر چھ درہم اور تین ڈالرز کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔ اپنا کریڈٹ کارڈ وہ غالباً" ہوٹل میں ہی چھوڑ آئی تھی۔ نہ ہی کوئی چیک بک اس وقت اس کے پاس تھی۔

"اب پے منٹ کیسے کروں؟" سمل بری طرح جھنجلائی۔

"ڈیڈ!" اس نے باپ کو فون کیا۔ "میں ٹاؤن سینٹر میں ہوں۔ ایک پرابلم ہو گئی ہے۔"

"کیوں، کیا ہو گیا؟"

"میں پرس میں پیسے رکھنا بھول گئی۔ اب کہاں سے لوں؟"

"جتنے پیسے چاہئیں واپس آکر لے لو۔" ان کی آواز میں دبا دبا سا جوش تھا۔ "میں گاڑی بھیجوں یا؟"

"گاڑی ہے میرے پاس اور ڈرائیور بھی ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے۔"

"پھر میں یہ پرفیوم چھوڑ کر آجاؤں؟" اس نے ایک حسرت بھری نظر اس پرفیوم پر ڈالی۔

"ہاں، تم آجاؤ تمہیں کسی سے ملوانا ہے۔"

"کس سے؟" وہ اچنبھے سے بولی۔

"ایک زبردست شخصیت میرے سامنے موجود ہیں۔"

"ہو گا کوئی آپ کا پرانا سنوکر فرینڈ۔" سمل نے منہ بنایا۔

"نہیں نہیں بھئی، ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہے تھے۔

"اچھا پھر میں آرہی ہوں۔"

"اوکے آل رائٹ جلدی سے آجاؤ۔" سمل نے سلسلہ منقطع کیا، سیلز مین کو مجبوری بتائی، ایک نگاہ کاؤنٹر پر رکھے گئے پرفیوم پر ڈالی اور شاپ سے باہر نکل آئی۔

اس کو آتا دیکھ کر شوفر نے پھرتی سے گاڑی کا دروازہ کھولا۔

آفس میں داخل ہو کر وہ سیدھی ریسپشن کی طرف بڑھ گئی۔ تب ہی اس نے کارنر میں لگے تین ایلی ویٹرز میں سے درمیان والے کا دروازہ کھلتے دیکھا باہر آنے والے چار افراد میں سے ایک کو دیکھ کر سمل جہانگیر سانس لینا ہی بھول گئی تھی۔

جان فلپس کے گہرے تھری پیس سوٹ اور ٹائی میں وہ بہت متاثر کن شخصیت کا مالک ڈیشنگ سا آدمی خرم ہی تھا۔ اس نے بال موز سے پیچھے کر رکھے تھے اور دائیں ہاتھ میں بریف کیس پکڑ رکھا تھا۔ وہ ناک کی سیدھ میں چلتا ہوا اس کے سامنے سے گزر کر باہر نکل گیا۔ اس کو عادت تھی ناک کی سیدھ میں چلنے کی۔ پوری دنیا کو نظر انداز کر کے وہ سیدھا ہی چلتا تھا۔

وہ محض اس کی ایک جھلک دیکھ پائی تھی اور اس ایک جھلک نے ہی اس کے وجود میں ہلچل مچا دی تھی۔

اس نے اسے پانچ برس بعد دیکھا تھا۔ وہ کہتا تھا میں بہت آگے جانا چاہتا ہوں، پوری دنیا فتح کرنا چاہتا ہوں، اس کے لباس اور انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ واقعی بہت آگے چلا گیا ہے، کئی ہوٹلز کی چین بنا چکا ہے وہ اتنا آگے چلا گیا ہے کہ سمل جہانگیر اس کے دماغ سے محو ہو گئی ہے۔

"بھلا کون ایک لنگڑی اور کم شکل لڑکی کو یاد رکھتا ہے۔" اس نے سوچا۔

تھکے تھکے قدموں سے چلتے ہوئے وہ شیخ جہانگیر سے ملے بغیر ہی واپس چلی گئی۔



"تم مجھ سے ملے بغیر کیوں چلی آئیں؟" وہ اس کے برابر والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔

سمل خاموشی سے اپنے جوتوں کو تکتی رہی۔

"میں تمہیں خرم سے ملوانا چاہتا تھا۔ وہ مجھ سے ایکسکیوز کرنے آیا تھا۔ بہت اچھا لڑکا ہے۔ بہت محنتی، محض چار پانچ برسوں میں اس نے اتنی ترقی کر لی ہے بہت کم....." اپنی ہی دھن میں بولتے ہوئے وہ ایک دم رک گئے۔

"کدھر گم ہو؟" انہوں نے اس کے چہرے کے آگے ہاتھ لہرایا۔

"یہیں ہوں۔" سمل نے سر اٹھایا۔ "مجھے کہاں جانا ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔

"اینی پرابلم؟" ان کے لہجے سے پریشانی جھلک رہی

تھی۔
اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔
"تو اتنی خاموش کیوں ہو؟"
"میں پہلے کب بہت بولتی ہوں۔" اس نے صوفے سے ٹیک لگالی۔
"پھر بھی کوئی بات تو ہے؟"
"آپ کو ماہ نور یاد نہیں آتی؟" انھوں نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔
"بتائیں ناڈیڈ! آپ کو نور یاد نہیں آتی؟" اس کا لہجہ نہ چاہتے ہوئے بھی تلخ ہو گیا تھا۔ "دو برس ہو گئے اس کو گھر چھوڑے ہوئے؟ کیا اتنی ڈھیر ساری دولت میں سے تھوڑی سی رقم بھی ہم اس کو نہیں دے سکتے تھے؟"
"اس نے طلاق لے لی تھی عدیم سے۔" وہ ایسے بتا رہے تھے جیسے اسٹاک کی صورت حال بتا رہے ہوں۔
"ک، کب؟" سمل کی آواز بمشکل نکلی تھی۔
"شادی کے تین ماہ بعد ہی۔"
"آپ کو کیسے ......؟" اس کی آواز اس کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھی۔
"میں ملا تھا اس سے۔" وہ سامنے رکھی میز کی شفاف سطح کو دیکھ رہے تھے۔ "وہ وہ نہیں رہی جو پہلے تھی بالکل بدل گئی ہے۔ پہلے میں نے سوچا تھا اس کو واپس لے آؤں مگر اس کو دیکھنے کے بعد میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔" وہ خاموش ہو گئے۔
"مگر، مگر ڈائیورس کیوں لی اس نے؟"
"عدیم کا امیر باپ کی غریب بیٹی کے ساتھ گزارا نہ ہو سکا تھا۔ بہت برے حالوں میں تھی ماہ نور۔ وہ نازوں میں پلی بڑھی تھی۔ بھلا کب تک برداشت کرتی۔ عدیم کے ساتھ کسی فارن ٹور پر گئی اور پھر وہیں طلاق لے لی۔"
"مگر ڈیڈ وہ تو اس سے بہت محبت کرتی تھی۔"
"پیٹ میں روٹی اور جیب میں پیسہ نہ ہو تو محبت دکھائی نہیں دیتی۔ بائیس سال تک عالیشان گھر میں شہزادیوں کی طرح پرورش پانے والی لڑکی جو فرانس کے پرفیومز اور لندن کے سوپ استعمال کرتی تھی ورساچی اور گوچی کے ملبوسات پہنتی تھی۔ وہ لڑکی بھلا کس طرح نویں منزل پر واقع چار کمروں کے فلیٹ میں رہ سکتی تھی۔ بچپن سے لے کر جوانی تک ماں باپ کی دولت پر عیش کرنے والے اپنے ہاتھ استعمال کرنا اپنی تضحیک سمجھتے ہیں۔ کتابوں اور قصے کہانیوں تک تو شاید محبت کی خاطر غربت میں گزارا ممکن ہے مگر پریکٹیکل لائف میں ایسا نہیں ہوتا۔"
نا چاہتے ہوئے بھی سمل کو کئی برس پہلے کی وہ شام یاد آ گئی جب اس نے خرم کے سامنے یہ شرط رکھی تھی۔
"میں تمہارے ساتھ تمہاری غربت میں گزارا کرنے کو تیار ہوں۔"
اس وقت جوش جذبات میں اس نے ایسا کہہ دیا تھا مگر کیا وہ اندرون شہر کے دو کمروں والے مکان میں اپنی پوری زندگی گزار سکتی تھی؟
جب خرم کے سامنے اس نے اپنی شرط رکھی تھی، تب بھی اس کے خیال میں یہی تھا کہ وہ مان جائے گا اور وہ اس کو سچ بتا دے گی۔ لیکن اگر وہ مان جاتا تو سمل کبھی نہ مانتی۔ منہ میں سونے کا چمچ لے کر پیدا ہونے والی لڑکی دو کمروں کے گھر میں نہیں رہ سکتی۔ نجانے کیوں اس وقت سمل کے اندر اس سے کوئی پوچھ رہا تھا "کیا تم نے غلطی کر دی۔ کیا اپنی غلطی کی وجہ سے تم نے اس کو کھو دیا؟"
"کہاں ہوتی ہے اب وہ؟" کچھ دیر بعد اس نے پوچھا۔
"کچھ عرصہ پہلے تک تو لاس ویگاس میں تھی۔ میں نے سنا تھا کسی پیانسٹ کے ساتھ رہ رہی ہے۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ کہاں ہے!" وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد گویا ہوئے۔ "اس نے مجھے اتنے دکھ دیے ہیں سمل! اب میرے دل میں اس کے لیے اب کوئی جگہ نہیں ہے اور پھر وہ مسکرائے "میرے پاس تم جو ہو۔ مجھے اور کسی کی ضرورت نہیں ہے۔" ان کے یوں مسکرا کر دیکھنے پر وہ بھی بھیگی پلکوں کے ساتھ مسکرا دی۔



"میرا موڈ نہیں ہے۔" ان کی اتنی منت سماجت کے جواب میں سمل کے پاس بس یہی چار لفظ تھے۔
"نہ ہو مگر تم چلو تو" وہ بضد تھے۔
"میرا موڈ نہیں ہے۔"
"وہاں عماد بھی ہو گا۔ جو لاسٹ ایئر دوبئی میں ملا تھا۔ یاد ہے؟ اس سے ہی مل لینا۔"
"اس کو تو اتنی بھی زحمت نہیں ہوئی کہ فون ہی کر لے حالانکہ جاتے وقت میرا نمبر لے کر گیا تھا۔" وہ منہ بنائے ہوئے بولی۔
اسے خرم کے ہوٹل میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ

صرف یہ سوچ رہی تھی کہ یہ جانتے بوجھتے بھی کہ وہ شیخ جہانگیر کی بیٹی ہے' خرم نے کیسے ان کی پوری فیملی کو انوائٹ کر لیا تھا؟ کیا وہ اس کا سامنا کر سکتا تھا؟ ہنس ہنس کر اس سے بات کر سکتا تھا؟ اس کی زندگی اس شخص نے اس سے چھین لی' اس کے خواب چکنا چور کر دیے' اس کے ارمانوں کا خون کر ڈالا۔

کیا وہ اس کو اپنا ہوٹل اپنی ترقی' اپنی دولت دکھا کر اس پر یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ وہ سمل جہانگیر کو استعمال کیے بغیر بھی بہت کچھ ہے؟ وہ اس کی دولت کو سیڑھی بنائے بغیر بھی بہت آگے پہنچ گیا ہے؟

فون کی گھنٹی اس کے خیالات میں مخل ہوئی تھی۔ چونک کر اس نے اپنے موبائل کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی۔ وہ صوفے پر ہی اس سے قدرے فاصلے پر پڑا تھا۔

"ہیلو مائی گریس فل لیڈی!" ایک شوخ سی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تھی۔

"کون بات کر رہا ہے؟" وہ پہچان نہیں پائی تھی۔

"آدمی کو آئی مین بندے کو عماد کہتے ہیں۔"

"ارے! آپ کو میرا خیال کیسے آگیا؟"

"وہ کیا ہے میڈم! کہ آج آپ کے فادر کو دیکھ کر خیال آیا کہ کچھ لوگ میرے فون کے انتظار میں جاگ رہے ہوں گے۔" وہ اپنے مخصوص شوخ و شریر لہجے میں بولا تھا۔

"میں سونے ہی لگی تھی۔" اس نے جلدی سے وضاحت کی۔

"آئیں کیوں نہیں؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"کدھر؟" وہ جان بوجھ کر انجان بن گئی تھی۔

"خرم کے ہوٹل کی افتتاحی تقریب تھی بھئی!"

"مبارک ہو۔"

"آئیں کیوں نہیں؟" وہ ٹلنے والا ہر گز نہ تھا۔

"عماد! میں ایک بزنس وومن ہوں۔ آج وہاں تو کل یہاں۔ سو بکھیڑے ہوتے ہیں۔ اتنا کام تھا آفس کا وہ بھی سنبھالنا تھا نا!" اپنے تئیں اس نے بہترین وضاحت دی تھی۔

"ذرا بھی کوآپریشن نہیں ہے باپ بیٹی میں۔" وہ ہنسا تھا "وہ کہہ رہے تھے فرینڈ آگئی تھی اس کی' کم از کم ان سے پوچھ کر جھوٹ بولنا تھا۔"

وہ کیا کہتی خاموش رہی۔

"میں انتظار کر رہا تھا تمہارا!"

"اچھا؟ مگر آپ تو میرا نمبر لے کر گئے تھے فون ہی کر دیتے" وہ طنزاً بولی۔

"بھئی تمہارا نمبر مجھ سے مس پلیس ہو گیا تھا ورنہ اتنی شاندار پرسنالٹی کو کوئی بھول سکتا ہے؟" وہ بشاشت سے بولا۔

"تم پاکستان آؤ نا کبھی!" سمل نے دانستہ موضوع بدل دیا۔

"دراصل میری اور ٹونی کی طرف سے شیری بلیئر اگلے مہینے پاکستان آرہی ہے۔"

وہ بے اختیار ہنس پڑی۔

"لو جی! اس میں ہنسنے والی کون سی بات ہے؟ وہ آئے تو اس سے پوچھ لینا۔ مجھ سے ریکویسٹ کر رہی تھی ساتھ آنے کی۔ پر میں نے کہہ دیا میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔"

"ہاں بھئی تم تو جیسے پرنس آف ویلز ہو؟"

"ارے اس پرنس کو کون پوچھتا ہے۔ میں تو اس سے بھی آگے کی چیز ہوں۔" وہ اکڑ کر بولا۔

"کس نے کہا؟" سمل نے بستر پر لیٹتے ہوئے پوچھا۔

"میرے باس نے۔" وہ فخریہ لہجے میں بولا۔

"اور وہ کون ہے؟" سمل نے بمشکل جماہی روکی اور آنکھیں دھیرے سے موند لیں۔

"خرم اور کون' بلکہ وہ تو یہ بھی کہہ رہا تھا عماد جیسا پورے یوکے میں کوئی نہیں ہے۔ یقین نہیں آتا تو پوچھ لو۔" اس کی بات پر ایک جھٹکے سے سمل نے آنکھیں کھول دیں۔

"عماد! چور! میرے فون پر کس سے کونے میں کھڑے ہو کر باتیں کر رہے ہو؟" بہت شوخ لہجہ تھا خرم کا۔

"ایک منٹ۔" وہ فون کان سے دور کرتے ہوئے بولا "تمہارا پرابلم کیا ہے۔ جتنے پیسے لگیں گے دے دوں گا۔ تمہاری طرح کنجوس نہیں ہوں۔" جواب میں خرم کا بھرپور قہقہہ سمل کی سماعت سے ٹکرایا تھا۔

"کم آن!" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "تمہیں انکل بلا رہے ہیں۔"

"اوہ' بابا نے مجھے رضی انکل کو فون کرنے کا کہا تھا۔ میں تو بھول ہی گیا۔" عماد کی بوکھلائی ہوئی آواز آئی تھی۔ پھر سمل کو ایسے لگا کہ جیسے اس نے فون کسی اور کو تھما دیا ہے۔

"تمہاری کال ڈسکنیکٹ کر دوں؟" خرم نے پیچھے سے اسے پکارا تھا۔

"نہیں' تم بات کر لو۔ بہت اچھی لڑکی ہے۔" وہ جاتے جاتے بولا تھا۔ سمل کی رگوں میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ عماد خرم کو اس سے بات کرنے کو کیوں کہہ رہا تھا؟

"ہیلو!" خرم کی آواز اسے سنائی دی۔ وہ عجیب سی کیفیت سے دوچار تھی۔ جواب دے یا نہ دے؟ بالآخر اس نے کانپتے ہوئے لہجے میں "ہیلو" کہا۔

"عماد کو اس کے فادر نے بلا لیا ہے۔ وہ تو چلا گیا ہے۔ آئے گا تو آپ سے بات کرے گا۔" خرم نے نہایت خوش اخلاقی سے کہا۔

سمل نے حیرت سے فون کو دیکھا۔ شاید خرم نے اس کی آواز نہیں پہچانی تھی۔

"آپ کون؟" وہ ایسے ہی پوچھ بیٹھی۔

"میں؟ میں خرم ہوں عماد کا دوست۔" وہ آرام سے گویا ہوا تھا۔

"اوکے بائے۔" اتنا کہہ کر سمل نے فون بند کر دیا۔

اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ جب اس نے خرم کی آواز سنی تھی تو وہ خوشی سے کانپنے لگے تھے مگر اس وقت اس کا پورا وجود غصے سے لرز رہا تھا۔

"میں ایسے ہی اس شخص کو دل میں بسائے بیٹھی ہوں جو میری آواز تک نہیں پہچانتا ہو نہہ! نفرت ہے مجھے تم سے خرم زید شدید نفرت۔"



عماد سے اس کی دوبارہ گفتگو پاکستان آنے کے ایک ہفتے بعد ہوئی تھی۔ وہ اپنی اسٹڈی میں بیٹھی آفس کا کام کر رہی تھی جب اس کا فون آیا۔

نہایت مصروف انداز میں سمل جہانگیر کے کہے گئے "ہیلو" کے جواب میں ایک دم ہی اس پر افتاد آئی تھی۔

"اس دن تو مجھے بہت طعنے مار رہی تھی کہ فون نہیں کرتے۔ خود سے اتنا بھی نہ ہوا کہ اس بے چارے کا حال ہی دریافت کر لو۔" بغیر سلام دعا کے وہ شروع ہو گیا تھا۔

"تم بے چارے کب سے ہو گئے؟" اس نے پین بند کر کے رکھ دیا اور آرام سے ٹیک لگا لی۔ جانتی تھی کہ اب لمبی بات ہو گی۔

"ارے تمہیں کیا پتا میں کتنے برے حالوں میں ہوں۔" وہ معصومیت سے بولا۔ "فلو ہو گیا ہے خراب سی آواز تو آ ہی رہی ہو گی۔"

"مجھے تو پانی گرنے کی آواز آرہی ہے۔ لگتا ہے کسی بچے کو نہلا رہے ہو بے بی سٹنگ کب سے شروع کر دی ہے تم نے؟"

"جی نہیں میں برتن دھو رہا ہوں۔" وہ تڑ سے بولا۔

"اچھا؟ کوئی نوکر نہیں ہے یہ کام کرنے کو؟"

"ایک تھا۔" وہ مصنوعی بے چارگی سے بولا۔ "مگر اب بھاگ گیا ہے۔"

"تو اور رکھ لینا تھا۔ اتنے پیسے نہیں ہیں کیا؟" وہ بھی اسی کے انداز میں بولی۔

"دراصل اس سے اچھا نوکر مجھے مل نہیں سکتا۔ ورنہ یو نو میرے ہوٹل پر تو پرنس چارلس بھی ڈیوٹی دینے کو تیار ہے۔"

"کیوں چھوڑ گیا تمہارا نوکر؟"

"کسی لڑکی کا چکر تھا۔" پانی گرنے کی آواز مسلسل آ رہی تھی۔

"اچھا؟" اسے تجسس ہوا تھا۔

"اس کو جتنے پیسے چاہیے تھے ہم اتنا پے نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لیے وہ چلا گیا۔" برتن کھڑکنے کی آواز بہت زور کی آئی تھی۔

"تو کر دیتے پے۔"

"ارے تم اس کی فکر میں ہلکان مت ہو۔ وہ اب بہت اچھے حالوں میں ہے۔ مسٹر نے اپنے کئی ہوٹلز بنا لیے ہیں۔ اب تو بہت بڑا آدمی ہو گیا ہے۔ تم تو جانتی ہو گی خرم زید کو؟"

"ہاں تھوڑا بہت" وہ سرد مہری سے بولی۔ "وہ نوکر تھا تمہارے ہوٹل پر؟"

"پاکستانیوں والا نوکر نہیں! ڈیوٹی منیجر تھا۔ ایک سال کام کر کے چلا گیا۔ مگر اب جب بھی آتا ہے تو میں اس سے برتن ضرور دھلواتا ہوں۔" وہ ہنستے ہوئے بتا رہا تھا۔ پانی گرنے کی آواز اب بند ہو چکی تھی۔

"موسم کیسا ہے؟" سمل نے دانستہ طور پر موضوع بدل دیا۔

"ہلکی ہلکی سنو پڑ رہی ہے۔ تمہاری طرف کیسا ہے؟"

"سردی ہے تھوڑی سی' برتن دھل گئے؟"

"ہاں اب آلو کاٹنے لگا ہوں۔" اس نے سہولت سے کہا۔

"تم ہوٹل کے سارے کام خود ہی کرتے ہو؟" وہ قدرے تنک کر بولی۔

"نہیں تو۔ دراصل ابھی ساڑھے تین بجے ہیں۔ چار بجے سب لوگ آنا شروع ہوتے ہیں میں نے سوچا ابھی سے ریسٹورنٹ کی تیاری کرلوں۔"

سمل نے ساڑھے آٹھ بجاتی گھڑی کی جانب دیکھا اور بولی "اور پڑھائی کیسی جارہی ہے۔"

"ارے یہ کیا پوچھ لیا؟" وہ سرد آہ بھر کر بولا۔

"کیوں؟" وہ حیران ہوئی تھی۔

"تمہیں کیا پتہ میں کتنا غریب ہوں - خود دیکھ لو میں بے چارہ غریب سالڑ کا یہاں بیٹھ کر آلو کاٹ رہا ہوں۔ میرے پاس تو نئی شرٹ خریدنے کے پیسے بھی نہیں۔ روز کئی گھنٹے ہوٹل پر جاب اپنی یونیورسٹی کے اخراجات پورے کرنے کے لیے کرتا ہوں۔ گھر میں سب سے بڑا ہوں۔ میری گیارہ بہنیں ہیں جن کی شادی مجھ بے چارے کو ہی کرانی ہے۔ ساتھ ساتھ اپنے ابو کی دوسری شادی بھی کرانی ہے۔ کیا کروں؟ اتنا غریب سالڑکا ہوں اور تم ہنس کیوں رہی ہو؟"

وہ مسلسل ہنستی چلی جارہی تھی۔

"اچھا عید کی شاپنگ کرلی؟" وہ پوچھنے لگا۔

"عید؟ ابھی تو گزری ہے۔" وہ تعجب سے بولی۔

"میں بڑی عید کی بات کررہا ہوں۔"

"وہ تو کافی دور ہے۔" وہ لاپروائی سے بولی۔ "بعد میں ہی شاپنگ کروں گی۔"

"ہاں ہاں ہم امیر لوگ تو بعد میں ہی شاپنگ کروگے - وہ جل کر بولا۔ "مگر ہم غریبوں کو تو ابھی سے پیسے جمع کرنا پڑیں گے۔ کتنا خرچا ہو جائے گا نا عید پر؟ اور پھر قربانی کے لیے گائے بلکہ اونٹ بھی تو لینا ہے۔"

اس کی بات پر سمل ایک دفعہ پھر ہنس پڑی اور جب کافی دیر تک بات کرنے کے بعد اس نے فون رکھا تو خرم کے متعلق عماد کی کہی ہوئی بات اس کے ذہن سے بالکل محو ہو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

ایتھنز اولمپکس ان دنوں بڑے زور و شور سے جاری تھے۔ لیکن کھیلوں میں دلچسپی نہ ہونے کے باعث سمل اپنی کاروباری مصروفیات میں سے وقت نکال کر تھیٹر یا میوزم چلی جاتی۔

اس شام بھی وہ فراغت کے چند لمحات میں اپنی بیساکھی کے سہارے چلتی ہوئی ہوٹل رٹز کارلٹن سے باہر نکل آئی۔ چونکہ اس وقت اس کا کہیں بھی جانے موڈ نہ تھا اس لیے وہ کچھ دیر تو فٹ پاتھ پر چلتی رہی، پھر ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔

شومئی قسمت کہ اس سنگی بینچ پر ایک فاریسٹ گمپ Forrest Gump کی نیچر والا بوڑھا ڈاکٹر بیٹھا تھا، جسے اپنے تجربات زندگی بیان کرنے کے لیے ایک آدمی کی تلاش تھی۔

شکل سے تو وہ سمل کو ڈنگر ڈاکٹر لگا تھا مگر بقول اس کے وہ ایک ماہر اسکن اسپیشلسٹ تھا۔ پہلے وہ سمل کو ایتھنز کے موسم کے حساب سے کچھ میڈیکل ٹپس دیتا رہا پھر اس کو اپنے مریضوں کے بارے میں بتانے لگا۔

"میں ہفتے میں ایک دفعہ انسر میری ہاسپٹل میں جا کر مریضوں کا علاج کرتا ہوں۔ وہاں پچھلے ایک برس سے ایک عجیب و غریب بیماری کا شکار ایک مریض داخل ہے۔ میں ان گیارہ ماہ میں اس کی بیماری نہیں سمجھ سکا۔ اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کے دانے نکل آئے ہیں۔ یہ دانے پچھلے گیارہ ماہ سے ٹھیک نہیں ہورہے اگر ایک دفعہ اس کے دانے ٹھیک ہو جائیں تو اس کی پلاسٹک سرجری ممکن ہے۔ لیکن چونکہ اس کے پاس پیسے ہی نہیں ہیں اس لیے یہ شاید نہ ہوسکے۔"

"بہت غریب ہے وہ؟" وہ از راہ ہمدردی پوچھنے لگی۔

"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کا باپ تو ارب پتی ہے۔"

سمل سمجھی وہ مذاق کررہا ہے۔ مگر اس کے چہرے کے سنجیدہ تاثرات دیکھ کر وہ ایک دم حیران سی ہوئی۔

"اس کا باپ ارب پتی ہے تو اس کی پلاسٹک سرجری نا ممکن کیوں ہے؟"

"اس کے باپ نے اپنی دولت میں سے اسے کچھ نہیں دیا!" ڈاکٹر سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"کیوں؟"

"پتہ نہیں، یہ پاکستانی ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

سمل نے چونک کر اسے دیکھا۔ "پاکستانی؟"

"ہاں۔" اس نے سر ہلایا۔ "میری پیشنٹ پاکستانی ہے. ماہ نور نام ہے اس کا" سمل ورطہ حیرت سے گنگ اسے دیکھتی رہی۔

"کدھر ہے آپ کا اسپتال؟" کچھ دیر بعد وہ بمشکل بولی تھی۔

"یہاں سے تقریباً" دو میل دور Syntagma Square پر ہے کیوں؟"

"میں آپ کے پیشنٹ سے مل سکتی ہوں ڈاکٹر؟"

☼ ☼ ☼

شیشے کی دیواروں کے اندر اسے رکھا گیا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ اور گلابی دانوں سے بھرا پڑا تھا۔ سمل نے اس حالت میں پہلے کبھی کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ اور ماہ نور کو دیکھنے کا تو تصور بھی نہیں کیا تھا۔ حیرت انگیز طور پر اس کی گردن، ہاتھ پاؤں سب صاف شفاف تھے مگر چہرہ خدا کی پناہ۔

اس کی بند آنکھیں ایک جھٹکے سے کھلی تھیں۔ ان میں یکدم حیرت در آئی تھی۔ چند ثانیے وہ سمل کو حیرت سے دیکھتی رہی، پھر اس حیرت کی جگہ نمی نے لے لی۔ اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو نکلے اور اس کے مسخ شدہ چہرے پر پھسلتے چلے گئے۔

ماہ نور نے اپنے نازک سے مخروطی انگلیوں والے خوب صورت ہاتھ سمل کے سامنے جوڑ دیے۔ وہ معافی مانگ رہی تھی۔

مگر کس بات کی؟

سمل کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

وہ آگے بڑھی اور اپنا چہرہ شیشے کی دیوار کے بہت قریب لے جا کر بولی۔ "نہیں نور! پلیز! معافی مت مانگو۔ تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔ میں، میں ابھی آتی ہوں۔" اتنا کہہ کر وہ مڑی اور تیز تیز چلتی ہوئی وہاں سے نکل آئی۔

ایک نیٹ کیفے میں جا کر اس نے دنیا کے بہترین اسکن اسپیشلسٹ کو سرچ کیا اور وہاں سے ورجینیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز کے ڈاکٹر ہڈسن کا کانٹیکٹ نمبر لے کر انہیں فون کیا۔ اس نے اپنی کمپنی کا حوالہ دے کر انہیں ماہ نور کی بیماری کی تفصیلات بتائیں۔ ڈاکٹر ہڈسن نے اسے تاکید کی کہ وہ فوراً کیس ہسٹری انہیں بھجوا دی جائے۔

کچھ دیر بعد وہ دوبارہ ڈاکٹر میلس کے سامنے موجود تھی۔ سب سے پہلے تو اس نے اپنے یوں اچانک غائب ہو جانے کی معذرت کی اور بتایا کہ وہ اس لڑکی کے علاج کے لیے ایک ڈاکٹر سے مشورہ کرکے آئی ہے۔

"اٹس آل رائٹ! مگر اب کوئی فائدہ نہیں!" وہ تاسف سے بتانے لگا "تمہارے جانے کے بمشکل تین منٹ بعد ہی اس لڑکی کی ڈیتھ ہوگئی تھی۔"

سمل ساکت سی ڈاکٹر میلس کا چہرہ دیکھنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کل رات ایک عجیب سی بات ہوئی۔"

"تمہیں کوئی لڑکی پسند آگئی ہے نا؟" وہ شرارتاً بولی۔

"نہیں بھئی!" اس نے بینچ سے کمر ٹکا دی اور کچھ سوچنے لگا۔

"کیا بات ہوئی؟" سمل کو تجسس ہوا۔

"کچھ نہیں۔" وہ سر جھٹک کر سیدھا ہو گیا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا "تم شادی کب کررہی ہو؟"

"میں؟" سمل نے حیران سی ہو کر اسے دیکھا۔ "میری شادی کی فکر چھوڑو اور ویسے بھی میں تب شادی کروں گی جب تم دو بچوں کے باپ بن چکے ہوگے۔"

"او مائی ڈیئر لیڈی! ام....."

"ڈونٹ کال می لیڈی۔" اس نے فوراً تنبیہہ کی۔

"آل رائٹ کڈو Kiddo! اب ٹھیک ہے۔" وہ شرارتاً مسکرایا۔

"عماد!" وہ چیخ کر بولی۔ "میں یہ کتاب تمہارے سر پر دے ماروں گی"

"اف! تم کیوں اتنی موٹی کتابیں پڑھتی ہو؟ ایک وہ خرم ہے وہ بھی اتنی موٹی بکس پڑتا ہے کہ میرا دماغ چکرا جاتا ہے اور ایک تم ہو!"

"عماد ایک بات کہوں" وہ دھیرے سے بولی۔

"ارشاد ارشاد"

"تم بتاؤ رات کو کیا ہوا تھا؟"

"رات کو؟ ہاں!" وہ ایک دم سنجیدہ ہوا تھا "رات کو خرم میرے پاس آیا تھا۔ وہ بہت ڈسٹرب لگ رہا تھا۔ کچھ دیر تو باتیں کرتا رہا، پھر اٹھ کر چلا گیا۔ مجھے لگ رہا تھا وہ کافی اپ سیٹ ہے۔ پتہ نہیں کیا بات تھی۔" عماد کہتے کہتے رک گیا۔

"ایسے کیوں دیکھ رہی ہو مجھے؟"

سمل جواب میں کچھ نہ بولی۔ خاموشی سے اپنی بیساکھی اٹھائی اور بینچ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"سمل، سمل کیا ہوا؟ میں نے کچھ غلط کہا ہے؟"

وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے ہائیڈ پارک سے نکلنے والے راستے کی جانب بڑھ رہی تھی۔
"سمل! کیا ہوا؟" وہ ایک دم پریشان سا ہو کر اس کے سامنے آگیا۔
"کتنے سال ہو گئے ہماری دوستی کو؟"
"تین چار سال مگر......"
"اور ان تین چار سالوں میں عماد، مجھے نہیں یاد ہماری کوئی ایسی گفتگو ہوئی ہو جس میں اس کا ذکر نہ ہو۔" وہ پھٹ پڑی تھی "تنگ آگئی ہوں میں اس کی تعریفیں سنتے سنتے جس چیز کا بھی ذکر کرو اس میں کہیں نہ کہیں سے خرم آجاتا ہے۔ کیا پرابلم ہے تمہارا۔ کیوں تم اس سے اتنے 'اتنے امپریس ہو؟ تم کیوں سمجھتے ہو کہ وہ بہت اچھا ہے؟ کتنا جانتے ہو تم اس کے بارے میں۔ تمہیں نہیں معلوم کہ وہ اندر سے کیا ہے!" وہ تھکے ہوئے لہجے میں کہتی ہوئی دوبارہ بینچ پر بیٹھ گئی۔
"اگر نو سال کسی کو سمجھنے کے لیے کم ہوتے ہیں تو شاید میں اس کو نہیں جانتا ہوں گا مگر۔" وہ بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "تم تو اس سے کبھی ملی ہی نہیں ہو تم نے تو شاید کبھی تصاویر کے علاوہ اسے دیکھا بھی نہیں ہو گا پھر تم کیسے اس کے اندر کے بارے میں اس طرح کے دعوے کر رہی ہو؟"
"تم سے کس نے کہا کہ میں اس سے نہیں ملی؟" ایک دم سر اٹھا کر وہ بولی۔
"تم ملی ہو خرم سے؟" عماد نے حیرت سے اسے دیکھا۔
"ہاں بھی اور نہیں بھی۔"
"مطلب؟"
"مطلب میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔ ابھی مجھے جانا ہے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
"تم جا کہاں رہی ہو؟" وہ بھی اٹھ گیا۔
"ہوٹل!" وہ مختصراً بولی۔ عماد بھی اس کے ساتھ چل پڑا۔
"ہوٹل کیوں؟ تھک گئی ہو؟"
"نہیں میری میٹنگ ہے۔"
وہ دونوں ہائیڈ پارک سے نکل آئے تھے۔
کیا تمہاری میٹنگ بہت خاص ہے کیا؟"
"عماد! میری میٹنگ پتا ہے کس کے ساتھ ہے؟" سمل گاڑی میں بیٹھ گئی مگر دروازہ بند نہیں کیا۔
عماد نے بھنویں اچکائیں۔ "جارج بش کے ساتھ؟"
"نہیں۔" اس نے نفی میں سر ہلایا اور مسکرا دی۔
"تمہارے دوست خرم کے ساتھ۔"
سمل نے گاڑی کا دروازہ بند کر لیا اور کھڑکی کے پار عماد کا حیرت زدہ چہرہ دیکھ کر مسکرا دی۔



اسے امید نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی آجائے گا۔ حالانکہ وہ تو ہمیشہ وقت کا پابند رہا تھا۔ جب وہ دونوں پارک میں ملتے تھے تو اکثر وہ پہلے سے وہاں بیٹھا ہوتا تھا۔ سمل کو ہمیشہ تھوڑی سی دیر ہو جاتی تھی۔ وہ اس تھوڑی سی دیر پر بھی کچھ نہ کہتا بلکہ ایک دلکش مسکراہٹ کے ساتھ اس کا استقبال کرتا۔
وہ وقت سے پندرہ منٹ پہلے پہنچ گیا تھا۔ آج اس کے چہرے پر وہ پہلے والی دلنشین مسکراہٹ نہ تھی بلکہ ایک عجیب سی سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں سمل کو بہت اداس سی لگی تھیں۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ صوفے پر بیٹھا وہ شخص بہت دکھی ہے۔ مگر وجہ......؟
کس چیز کی کمی تھی اس کے پاس؟ سب کچھ تو تھا اس کی دسترس میں۔ اس نے بالآخر سب پا لیا تھا۔
"آئی ایم سوری مسٹر زید! آپ کو میری وجہ سے انتظار کرنا پڑا۔" وہ اجنبیت سے کہتے ہوئے اس کے مقابل صوفے پر بیٹھ گئی۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ آگئے ہیں۔"
"انتظار؟" خرم نے سوچا۔ "ہاں بہت لمبا انتظار تھا میرا۔ بہت کٹھن" اس نے سر اٹھا کر سمل کی جانب دیکھا مگر بولا کچھ نہیں۔
سمل نے گھڑی کی جانب نگاہ دوڑائی۔ "القریش انٹرپرائزز کے چیئرمین تو مقررہ وقت پر ہی آئیں گے۔ میرا مطلب ہے پندرہ منٹ بعد۔" وہ تھوڑی سی گڑبڑا گئی تھی۔ شاید وہ نروس ہو رہی تھی۔
اپنے ہاتھوں کی لرزش چھپانے کے لیے اس نے انہیں اپنی گود میں رکھ لیا اور خرم کی جانب دیکھا جو مسلسل اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا کہ وہ زیادہ دیر وہاں نہ دیکھ سکی اور قدرے سٹپٹا کر ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ پھر سینٹرل پر پڑا ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کر دیا اسکرین پر ورلڈ کپ کی افتتاحی تقریب دکھائی جا رہی تھی۔

اس نے پہلو بدلتے ہوئے خرم کو دیکھا۔ وہ ابھی تک اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کی حدت سے گھبرا کر اس نے میز پر رکھا ریموٹ دوبارہ اٹھا لیا اور آواز تھوڑی سی تیز کر دی۔
"کیسی ہو سمل؟" وہ ہولے سے بولا۔
"آئی ایم آل رائٹ مگر......"
"میں یہاں کیوں آیا ہوں معلوم ہے تمہیں؟"
"کیونکہ آپ ہمارے ساتھ......" خرم نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کرا دیا۔
"میں ایک نیم پاگل سائیکک کی بات مان کر ادھر آیا تھا اور مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم یہاں ہو گی۔ ان فیکٹ میرا خیال تھا میں ماہ نور سے ملنے آرہا ہوں۔"
"مگر ماہ نور تو......" وہ یکدم خاموش ہو گئی۔ یہ بات تو اس نے شیخ جہانگیر کو بھی نہیں بتائی تھی پھر اسے کیسے بتا دیتی۔
"ماہ نور مر چکی ہے نا؟" اس کو خاموش دیکھ کر وہ کہنے لگا۔ "مجھے معلوم ہے۔"
"آپ' آپ کو کیسے....؟" وہ حیرت سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔
"مجھے ایک نیم پاگل سائیکک نے بتایا تھا۔" وہ زیر لب مسکرایا۔
"جی؟" وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔
"سمل! تم نے مجھے مس کیا؟"
"نہیں" آپ میری زندگی سے نکل چکے ہیں۔ میں آپ کو مس کیوں کروں گی؟" اس کی آواز میں لرزش تھی۔
"نہیں سمل! میں تمہاری زندگی سے نہیں نکلا تھا۔ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں گیا تھا۔" وہ دھیرے دھیرے بتا رہا تھا۔
"تم نے کہا تھا کہ اگر مجھے تمہاری شرط منظور ہے تو ٹھیک ہے ورنہ الوداع۔"
اس وقت کہنے کو میرے پاس بھی بہت کچھ تھا مگر تم نے مجھے چوائس ہی نہیں دی تھی۔ تم نے مجھے میری نظروں میں گرا دیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں کچھ کہوں گا تو تم اسے میرا لالچ گردانو گی۔ اسی لیے میں الوداع کہہ کر وہاں سے واپس آگیا۔ اس روز میرا شوق' میرا خواب' میرا جنون میرا مقصد بن گیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں اس وقت تک واپس تمہارے پاس نہیں آؤں گا جب تک میری حیثیت تمہارے باپ کے برابر نہ ہو۔ تم یہ کہہ سکتی ہو کہ میں کیوں واپس نہیں آیا۔ لندن میں میں ماہ نور سے ملا تھا۔ اس نے نجانے کیوں مجھ سے جھوٹ بولا۔ اس نے.... اس نے کہا کہ کہ تم مر گئی ہو۔ تم نے خودکشی کر لی ہے اور میں' میں اسے سچ سمجھ بیٹھا میں تو اب بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ تم ماہ نور ہو گی۔"
"مسٹر زید!" وہ کہنے لگی تھی کہ اس کا موبائل بج اٹھا۔ اس نے موبائل کان سے لگایا اور کچھ دیر دوسری جانب سے کہی جانے والی بات سنتی رہی پھر "اوکے۔" کہہ کر اس نے موبائل آف کر دیا۔
"ہانی بن طلال نہیں آسکیں گے۔" وہ خرم کو بتانے لگی۔ "ان کی بیٹی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔" وہ اپنا پرس' کتاب اور بیساکھی سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔
"سمل!"
"مسٹر زید! مجھے اور بھی بہت سے کام کرنے ہیں۔ جب تیسرا فریق ہی نہیں ہے تو اس کا صاف مطلب ہے کہ میٹنگ آف ہو گئی ہے۔" وہ دروازے کے قریب پہنچ گئی تھی۔
"سمل! پلیز میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔" اس کی آواز میں شکستگی تھی۔ "دیوانگی کی حد تک میں نے تم سے عشق کیا ہے۔" وہ جیسے اس کی منت کر رہا تھا۔
سمل جہانگیر ایک جھٹکے سے مڑی۔ "اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ میں پہلے کی طرح اب بھی تمہاری باتوں میں آکر تم پر یقین کر بیٹھوں گی تو یہ تمہاری بھول ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تم میرے پیچھے کیوں پڑے ہو۔ کیا ہے مجھ میں؟ کیوں تم ایک لنگڑی اور معمولی شکل کی لڑکی کے جذبات سے کھیل رہے ہو؟ مجھے نہیں معلوم تم اتنی دولت اکٹھی کر لینے کے بعد بھی مجھ سے کس جاگیر کی تمنا رکھے ہوئے ہو؟ میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتی۔ میں اب بدل گئی ہوں' بہت زیادہ۔" مزید کچھ کہے بغیر وہ دروازہ کھول کر باہر نکل گئی۔
اس کی سخت باتوں کا برا مانے بغیر وہ صوفے پر بیٹھا ایک آواز کو یاد کر رہا تھا۔
"اس نے تمہارے لیے خود کو بدلا ہے۔ کیونکہ وہ تم سے بہت محبت کرتی ہے۔"
"کیا واقعی؟" وہ خالی کمرے کی دیواروں سے پوچھنے لگا۔ اس کے سوال کے جواب میں ہر طرف عمیق سناٹے

چھائے رہے۔ ہر سو خاموشی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیسی رہی تمہاری میٹنگ؟" اس نے چاول پلیٹ میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"زبردست!" اس کے لہجے میں بشاشت تھی۔

"اچھا تم خرم سے ملیں؟" اس کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

"ہوں۔" چمچہ منہ میں رکھتے ہوئے اس نے سرسری سا جواب دیا۔

"صبح تم بتا رہی تھیں کہ تم اس سے پہلے بھی ملی ہو؟"

"ہاں!" وہ اب مکمل طور پر کھانا کھانے میں مشغول تھی۔

"اور تم نے کہا تھا کہ تم ڈیٹیلز بعد میں بتاؤ گی۔"

"ہاں۔"

"پھر اب منہ سے کچھ پھوٹو۔" اس کے مختصر جوابات پر وہ تنگ کر بولا۔

"پہلے تم ایک بات بتاؤ۔" وہ سوال جو عماد سے خرم کی دوستی کا علم ہونے کے بعد سے ہی سمل کے دماغ میں گھوم رہا تھا' اس نے بالآخر عماد سے پوچھنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

"پوچھو۔"

"یہ جو تمہارا دوست ہے خرم۔" اس نے چمچہ پلیٹ میں رکھ دیا اور پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو گئی۔ "اس کی شادی وادی نہیں ہوئی کیا؟"

"کیوں؟ تمہارا اس پر دل آ گیا ہے کیا؟" وہ شوخی سے بولا۔ اس بات پر سمل احتجاج کرنے ہی لگی تھی کہ وہ مصالحتی انداز میں ہاتھ اٹھا کر بولا۔ "دیکھو میں مذاق کر رہا تھا۔ اچھا ویسے اگر تمہارا اس پر دل آ بھی گیا ہو تو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ پہلے سے ہی کسی کے عشق میں بری طرح گرفتار ہے۔"

سمل کے دل کو کچھ ہوا تھا۔ تو کیا واقعی خرم کسی اور سے عشق کرتا ہے؟

"کس کے عشق میں؟"

"ٹوئی بیلیشر کے۔ بھئی ظاہر ہے ایک لڑکی کے۔"

"کون تھی؟"

"تھی ایک بادشاہ کی بیٹی!" وہ لاپروائی سے بولا۔

"عماد! تم کبھی سیریس ہو سکتے ہو؟" وہ جھلا کر بولی۔

"میں سیریس ہوں۔ تم نے پوچھا وہ کون تھی۔ میں نے بتا دیا کہ وہ ڈاٹر آف اے کنگ تھی۔"

"کنگ آف جارڈن یا کنگ آف سعودی عربیہ؟"

"کنگ آف اسلام آباد۔"

"کیا مطلب؟" وہ سمجھ نہیں پائی تھی۔

"اچھا مجھے کھانا کھانے دو۔"

پھر پلیٹ میں موجود چاول ختم کرنے کے بعد اس نے دوبارہ ڈش کی جانب ہاتھ بڑھایا تو سمل نے فوراً ڈش اپنی طرف کر لی۔ "کتنا کھاؤ گے؟ اتنی دیر سے کھا رہے ہو۔ اب بس کرو اور مجھے پوری بات بتاؤ۔"

"او کے۔" اس نے پلیٹ ایک طرف کھسکا دی۔

"خرم از اے سیلف میڈ ٹائی کون۔ اس کا باپ ایک معمولی سا سرکاری ملازم تھا۔ اس کی فیملی بہت غریب تھی۔ اس کا باپ چاہتا تھا کہ وہ سی ایس ایس کرنے کے لیے ماسٹرز کرے جبکہ اس کو ہوٹلئیر بننا تھا۔ اسی لیے وہ اپنی پڑھائی کا خرچہ خود ہی اٹھانے کے لیے دو دو جابز کرتا تھا۔ ایک طرف کال سینٹر پر ٹیلی فون آپریٹر اور دوسری جانب ایک ہوٹل میں ویٹر۔ یہ تب کی بات ہے جب وہ پاکستان میں ہوتا تھا۔

پھر ایک دن ایسا ہوا کہ غلطی سے اس نے چائے یا جوس ایک کسٹمر کے کپڑوں پر گرا دیا۔ وہ لڑکی اس ہوٹل کے اونر کی بیٹی تھی۔ اس نے خرم کو ذلیل کر کے ہوٹل سے نکلوا دیا۔ خرم کو اس جاب کی شدید ضرورت تھی۔ اس کو سمسٹر کی فیس جمع کرانی تھی۔ مگر چونکہ وہ اب....."

"میں نے اس لڑکی کے متعلق پوچھا تھا' تم کون سے قصے کہانیاں لے کر بیٹھ گئے ہو؟" وہ بے چینی سے اس کی بات کاٹ کر بولی۔ "بر تفصیلی بتاؤ۔"

"اچھا چلو بر تفصیلی بتاتا ہوں۔ ایک دن وہ اپنے اسٹوڈنٹس کے ساتھ پارک گیا۔ وہیں اس کو ایک لڑکی نظر آئی۔ خرم کہتا ہے اس نے اتنی خوب صورت اور معصوم لڑکی آج تک نہیں دیکھی تھی۔ وہ لڑکی کوئی ناول پڑھ رہی تھی پھر اس کی امی اس کو وہیں چھوڑ کر چلی گئیں۔ یہ خرم تھا جو اس کی وہیل چیئر چلا کر اس کو اتفاقیہ طور پر اس کے گھر کے قریب چھوڑ آیا تھا۔ وہ لڑکی ایک ٹانگ سے معذور تھی۔ مگر خیر اس سے کیا فرق پڑتا ہے محبت ظاہر کی بجائے باطن سے ہوتی ہے۔ ویسے خرم کو پہلی نظر کی محبت ہوئی تھی۔ بعد میں وہ اس لڑکی سے ملا میں نے بتایا تھا نا کہ ایک لڑکی نے خرم کو جاب سے نکلوایا تھا۔ وہ لڑکی اس لڑکی کی بہن تھی۔

قصہ مختصر کہ اس لڑکی کا باپ ایک کنگ تھا آئی مین بہت رچ۔ بہت زیادہ اور خرم بہت غریب تھا۔ پھر بھی خرم نے اس کو پرپوز کر دیا۔ جواب میں اس لڑکی نے خرم کے سامنے یہ شرط رکھ دی کہ وہ اس سے صرف اسی صورت میں شادی کرے گی کہ وہ اس کی باپ کی دولت میں سے ایک پائی بھی نہیں لے گا۔ یہ اس کی بے عزتی تھی اسے خرم کی محبت پر بھروسہ نہیں تھا۔ خرم بغیر کچھ کہے وہاں سے چلا آیا کیونکہ وہ جان چکا تھا کہ اس کی غربت اس کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ وہ بہت ambitious تھا۔ وہ اس لڑکی کے لیے پاکستان چھوڑ کر انگلینڈ آ گیا وہ چاہتا تھا کہ بہت سی دولت کمائے تاکہ اس کی حیثیت اس لڑکی کے باپ کے برابر ہو جائے۔ فرینکلی اسپیکنگ اگر میں اس کی جگہ ہوتا اور کوئی میری یوں انسلٹ کرتا تو میں تو واپس مڑ کر اس کی طرف دیکھتا ہی نہیں۔ مگر خیر! خرم نے محنت کرنا شروع کی۔ اس کے پاس عقل بھی تھی اور کچھ لک Luck بھی کہ وہ کتنا آگے پہنچ گیا ہے۔ لیکن اس دوران اسے معلوم ہوا کہ وہ بے وقوف لڑکی اس کے چلے آنے کو بے وفائی سمجھ کر خود کشی کر بیٹھی ہے۔ اس لڑکی کی بہن نے خرم کو بتایا تھا یہ سب مگر اب تو اس کو مرے ہوئے کئی برس بیت گئے ہیں۔ پھر بھی وہ اس کو بھولا نہیں ہے۔ اس لڑکی نے ایک دفعہ اپنا کوئی خواب خرم کو بتایا تھا کہ اس کا کسی آئی لینڈ پر ایک قطعے ہو اور یقین کرو کہ خرم نے ڈارک ہاربر میں ایک "ولا" بھی لے لیا ہے۔ حالانکہ وہ مر چکی ہے۔ ویسے کتنی بے وقوف تھی نا! خود ہی شرط رکھی' اس کو ہرٹ بھی کیا اور پھر خود ہی اپنے آپ کو مار ڈالا۔ تم' تم رو کیوں رہی ہو؟" وہ ایک دم گھبرا گیا تھا۔

وہ سر میز پر رکھے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ عماد صحیح کہتا تھا۔ اس کو اپنی محبت پر اعتماد ہی نہ تھا۔ کاش اس نے ماہ نور کے بجائے اپنی ماں یا باپ کو اعتماد میں لیا ہوتا۔ اس نے اس کو ایک بار ریجیکٹ کر دیا۔ وہ اسے اتنا چاہتا تھا اور اس نے کیا کیا اس کے ساتھ؟

"سمل! کیا ہو گیا بھئی! تم اس کی لو اسٹوری سن کر دکھی کیوں ہو گئیں؟ ایک تو تم لڑکیاں بھی نا دوسروں کے دکھ سن کر آنسو بہانے لگتی ہو! اسی لیے میں کہتا ہوں....." سمل نے اس کی بات کاٹ دی۔

"دوسروں کے دکھ؟" وہ دھیرے سے بولی۔ یہ اس کے دکھ تھے اور اسی کو سمیٹنے تھے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے ویٹر کو بلایا اور ایک کاغذ اور پین لانے کو کہا۔ کاغذ پر چند سطریں لکھیں اور اسے عماد کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"یہ کیا ہے؟"

"یہ تم خرم کو دے دینا ٹھیک ہے۔"

"خرم کو؟ کیوں؟" ایک دم عماد کو جھٹکا سا لگا۔ "کہیں تم اسے یہ تو نہیں بتا رہیں کہ میں نے تمہیں اس کی لائف ہسٹری بتا دی ہے؟"

"نہیں!" ہتھیلی کی پشت سے اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔

"پھر؟" اس نے ابرو اچکائے۔

"یہ بس اسی کے لیے ہے۔" وہ مسکرائی۔ "عماد! جس لڑکی سے خرم پیار کرتا تھا' اس کا نام کیا تھا؟"

"پتا نہیں!" عماد نے شانے اچکائے "اس نے مجھے کبھی نہیں بتایا۔"

"بٹ آئی نو۔" وہ نم آنکھوں کے ساتھ مسکراتے ہوئے بولی۔ "اس کا نام تھا۔" وہ ایک لمحے کو رکی۔ "اس کا نام تھا۔ سمل جہانگیر۔"

"تت تم اس کی روح ہو؟" وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا۔

جواب میں وہ ایک مترنم سا قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

خرم کے نام اس کاغذ میں اس نے لکھا تھا۔

"خرم! تمہاری سمل اپنے ڈارسی کا انتظار کر رہی ہے۔"

اسے معلوم تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔

نو سال' دو مہینے اور تئیس دن کی جدائی نے سمل جہانگیر کو بالآخر یہ بات سمجھا ہی دی تھی کہ انسان کی قسمت کا تعلق اس کی شکل و صورت سے نہیں ہوتا۔ ماہ نور جیسی حسین لڑکی ایٹھنز جنرل انسرمری میں تڑپ تڑپ کر خالی ہاتھ دنیا سے جا سکتی ہے اور سمل جہانگیر جیسی واجبی صورت والی لڑکی کو سچی محبت بھی مل سکتی ہے۔ محبت حسن اور خوب صورتی کی محتاج نہیں ہوتی۔ یہ تو دل میں بستی ہے۔ اور اس کو صرف قسمت سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے اور اعتبار و اعتماد سے پائیدار بنایا جا سکتا ہے۔

محبت یا تو ہوتی ہے یا پھر نہیں ہوتی اور اگر محبت "ہو" تو وہ کبھی ختم نہیں ہوتی' چاہے وہ دھیرے دھیرے دلوں میں جنم لینے والی محبت ہو یا پہلی نظر کی۔

"اور کون کہتا ہے پہلی نظر کی محبت پائیدار نہیں ہوتی۔" سمل نے مسرت سے سوچا تھا۔

☆ ☆ ☆

"آپ کے لیے ایک وزیٹر ہے میم!" اس کی سیکرٹری نے عماد کے جانے کے تین گھنٹے بعد اسے اطلاع دی۔ اس کا دل ایک دم دھڑکا تھا۔

"ک' کون ہے؟" وزیٹنگ کارڈ ہاتھ میں پکڑتے ہوئے وہ بے خیالی سے بولی۔

"یہ صاحب باہر لابی میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" وہ اتنا کہہ کر چلی گئی۔ سمل نے اس وزیٹنگ کارڈ کو بغور دیکھا۔ وہ خرم کا تھا۔

اس نے جلدی سے بالوں میں برش پھیرا اور ہمیشہ کی طرح آنکھوں میں کاجل ڈالا۔ اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتے ہوئے پہلی دفعہ اسے لگا تھا کہ وہ خوب صورت لگ رہی ہے۔ واقعی' سچی محبت کے حسین رنگوں نے اس کے چہرے پر ایک عجیب سا حسن پیدا کر دیا تھا۔ وہ یونہی مسکرا دی اور باہر جانے کے لیے مڑی۔

وہ لابی میں ہی ریسپشن ڈیسک پر کہنی ٹکائے کھڑا تھا۔ سمل کو آتا دیکھ کر وہ ایک دم ہی سیدھا ہو گیا۔ اس کو دیکھ کر سمل کو اپنی قسمت پر رشک آنے لگا۔ وہ اس شخص کی محبت تھی' جس پر دنیا رشک کرتی تھی۔

"سمل!" وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔

"بیٹھو گے یا باہر چلنا ہے؟"

"نہیں نہیں' میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔" وہ تیزی سے بولا۔ "دراصل میرا ایک بہت اہم ڈیلیگیشن نیواڈا Nevada جا رہا ہے۔ مجھے ان کو سی آف کرنے جانا ہے۔ میں بس تمہیں ہیلو کرنے آیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا تم ایک دفعہ پھر میری طرف سے کسی غلط فہمی کا شکار ہو جاؤ۔"

سمل گنگ سی اسے دیکھنے لگی۔ اس کو اس سے اس رویے کی ہرگز توقع نہ تھی۔

"آئی ایم سوری!" وہ دھیرے سے بولا۔ "دیکھو' ناراض مت ہونا۔ مجھے تمہاری فیلنگز کا اندازہ تھا اور مجھے خود بھی برا فیل ہو رہا ہے مگر ورک از ورک۔ تم تو خود بزنس وومن ہو' جانتی ہو۔"

"اٹس آل رائٹ خرم!" وہ زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔

"اوکے بائے۔" اتنا کہہ کر وہ مڑا۔ اس کی چوڑی پشت اس کی جانب تھی۔ وہ واقعی مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا۔

یک دم اس نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور واپس آگیا۔

"تم فارغ ہو؟"

"میں؟ ہاں کیوں؟" وہ حیران سی پوچھنے لگی۔

"ایسا ہے سمل! کہ مجھے یہاں سے ایئرپورٹ جانے تک قریباً" آدھا گھنٹہ تو لگ ہی جائے گا۔ کیوں نہ تم بھی میرے ساتھ چلو؟"

"ٹھیک ہے۔" اس نے شانے اچکا دیے۔ وہ اب خرم کی کسی بات سے انکار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ہوٹل سے باہر نکل آئے۔

شوفر سیموئیل نے فوراً" آگے بڑھ کر ریڈ رولز رائس کا پچھلا دروازہ سمل کے لیے کھول دیا جبکہ خرم دوسری طرف سے آکر سمل کے ساتھ بیٹھ گیا۔

جیسے ہی گاڑی چلی' اس نے اپنے بریف کیس میں سے اپنا لیپ ٹاپ نکالا اور اسے آن کر کے کچھ کام کرنے لگا۔ سمل نے بددل سی ہو کر اپنی نگاہیں کھڑکی سے باہر دوڑتے درختوں پر ٹکا دیں۔

ایک گارڈ کے ہمراہ وہ لوگ "ممنوعہ" علاقے میں پہنچے۔ سمل کو اپنے سامنے ایک خوب صورت "چیلنجر" دکھائی دے رہا تھا۔

"یہی ہے وہ جہاز جس میں تمہارے ڈیلیگیشن نے جانا ہے؟" وہ اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"ہاں' معلوم نہیں وہ لوگ کب تک پہنچیں گے۔" خرم نے گھڑی پر نگاہ دوڑاتے ہوئے پریشانی کے عالم میں کہا۔

"پہنچ جائیں گے۔ ڈونٹ وری۔" وہ دھیرے سے بولی۔

خرم نے اس کی طرف دیکھا۔ "تم کھڑے کھڑے تھک جاؤ گی۔ ایسا کرتے ہیں کہیں چل کر بیٹھتے ہیں۔"

"کدھر؟ ایئرپورٹ لاؤنج میں؟"

"لاؤنج میں؟" اس نے کچھ دیر سوچا۔ "نہیں پھر دوبارہ یہاں آنے کے لیے آئی۔ ڈی چیک کرانی پڑے گی۔ چھوڑو' ایسا کرتے ہیں پلین میں بیٹھ کر انتظار کرتے ہیں۔"

وہ دونوں سیڑھیوں کے ذریعے اس لگژریس جہاز کے اندرونی حصے میں پہنچ گئے۔ کاک پٹ میں سے ایک ہوسٹس نکلی اور ان کو دیکھ کر بے ساختہ "گڈ ایوننگ" بولی جواب میں خرم اور سمل نے "گڈ ایوننگ" کہا اور آرام

سے سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ اتنے میں فلائٹ اٹینڈنٹ نے آکر کیبن کی طرف کھلنے والا دروازہ بند کر دیا۔

"اور کتنی دیر لگے گی خرم؟" وہ جیسے تھک کر بولی۔

"کم آن سویٹ ہارٹ! تھوڑی دیر اور! پھر ہم ایک اچھے سے امریکن ریسٹورنٹ میں جا کر کھانا کھائیں گے۔" وہ جیسے اسے بہلا رہا تھا۔

جب وہ اندر داخل ہوئے تھے تو جہاز کا انجن آن تھا مگر ایک دم ہی اس وقت Jets کی آواز تیز ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے جہاز رن وے پر ٹیکسی کرنے لگا۔

"خرم!" وہ ایک دم چیخی تھی۔ "جہاز' جہاز چل رہا ہے۔"

"سمل! ڈونٹ بی سلی!" وہ اس کے ساتھ والی سیٹ پر آکر بیٹھ گیا۔ "جہاز کیسے چل سکتا ہے؟"

"خرم! دیکھو!" اس نے زرد پڑتے چہرے کے ساتھ کھڑکی کے باہر اشارہ کیا "وی آر موونگ۔"

"کیا؟" وہ حیرانی سے بولا۔

"جاؤ' جا کر پائلٹ سے کہو کہ وہ جہاز روکے۔" وہ بے حد گھبرا گئی تھی۔

"سمل! میں اس سے نہیں کہہ سکتا۔ وہ اب اسٹارٹ کر چکا ہے۔"

"خرم! پلیز اس سے کہو' دیکھو جہاز اب فلائی کر رہا ہے۔"

"تو کرنے دو نا۔" وہ آرام سے سیٹ کی پشت پر سر ٹکاتے ہوئے بولا۔

"کیا مطلب؟" اس نے گردن موڑ کر اپنے بہت قریب بیٹھے خرم کو دیکھا۔ "تم جا کر پائلٹ سے....." وہ ایک دم رک گئی۔

"خرم! یہ جہاز کس کا ہے؟"

"تین سال پہلے میں نے خریدا تھا۔" اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں اور یہ کیا ڈرامہ ہے؟" وہ چیخ کر بولی۔

"ابھی تو میں نے بتایا تھا۔ تھوڑا سا انتظار اور کرو پھر ہم ایک اچھے سے امریکن ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کھانا کھائیں گے۔ آف کورس ہم نیویارک جا رہے ہیں۔"

"ہم' ہم کیسے جا سکتے ہیں؟ میں نے تو کپڑے بھی نہیں

کھائے نہ ہی.....“

”امریکہ میں بوتیکس نہیں ہوتے کیا؟“ وہ معصومیت سے بولا۔

”اوہ خرم! میں تمہیں قتل کردوں گی۔“ اس نے سچ مچ ہاتھ بڑھا کر اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ برابر ہنسے جا رہا تھا۔ اسی لمحے ہوسٹس وہاں آئی تھی۔ گھبراہٹ میں پہلے ایک لمحے کو تو سمل خرم کی گردن سے اپنے ہاتھ ہٹانا ہی بھول گئی۔ پھر جلدی سے اس نے اپنے ہاتھ پیچھے کیے۔

”نیور مائنڈ۔“ وہ شوخی سے بولا ”میری فیانسی بہت رومانٹک ہو رہی ہے۔“ اس کی بات پر ایک طرف تو سمل اسے غصے اور خفت سے دیکھنے لگی جبکہ دوسری طرف ہوسٹس معنی خیز انداز میں مسکرانے لگی۔

”اینی تھنگ یو نیڈ سر؟“

”نو تھینکس!“ خرم شرارت سے بولا۔ ”بس ہم دونوں لوبرڈز کو کچھ لمحے اکیلے گزارنے کو مل جائیں تو.....“

اس نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”وہ سر ہلاتے ہوئے چلی گئی تو وہ اس پر پل پڑی۔

”میں کب سے تمہاری فیانسی بن گئی؟“ وہ نروٹھے لہجے میں بولی۔

”جب سے تمہارے ڈیڈ نے میرا رشتہ قبول کیا ہے۔“ وہ شرارت سے مسکرایا۔

”واٹ؟“ وہ حیران سی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

”تمہارے والد سے میری فون پر بات ہوئی تھی۔ انہی سے پوچھ کر تو تمہیں ساتھ لے کر جا رہا ہوں۔“

”جہانگیر انکل نہیں بولا جاتا تم سے؟“

”اوکے میم! تو آپ نے مجھے ان کا داماد مان ہی لیا۔“ وہ فرضی کالر جھاڑتے ہوئے بولا۔

”ہونے والا۔“ سمل نے فوراً ٹکڑا لگایا۔

”واٹ ایور!“ اس نے ہنستے ہوئے شانے اچکائے۔

”کیا پوچھا تھا تم نے ڈیڈ سے؟“ وہ تفصیلات جاننے کے لیے بے تاب تھی۔

”یہی کہ اگر میں آپ کی بیٹی کو اغوا کر کے لے جاؤں تو آپ میرے خلاف پرچا تو نہیں کٹوائیں گے؟“

”انہوں نے کیا کہا؟“

”انہوں نے کہا اگر میں پرچا کٹواؤں گا تو تم اپنے ارادے سے باز آجاؤ گے؟“ میں نے کہا ”ہرگز نہیں..... یہ تو ممکن ہی نہیں۔“

”تم نے یہ کہہ دیا؟ اتنے بدتمیز ہو تم؟“ سمل کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”جسٹ کڈنگ! انہوں نے فوراً“ اجازت دے دی تھی۔“ وہ مسکرایا۔

”ویسے ان کو یہ سب معلوم کیسے ہوا؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”آؤٹ لائنز میں نے بتا دیں‘ باقی عماد کی ڈیوٹی لگا آیا ہوں۔“

”ویسے خرم!“ کسی اچانک خیال کے تحت وہ بولی۔ ”یہ مجھے اغوا کرنے کا آئیڈیا کس کا تھا؟“

”میرے باس کا۔“

”عماد کا؟“ سمل نے اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگائی۔ خرم نے سر ہلا دیا۔

”ویسے یہ تم دونوں میں سے باس کون ہے؟ ان فیکٹ عماد تمہیں باس کہتا ہے۔“

”جو ہم میں سے زیادہ ایڈیٹ ہے وہ باس ہے۔“ وہ مزے سے بولا۔

”اسی لیے وہ تمہیں باس کہتا ہے۔“

”ویسے ہیں تو ہم دونوں ہی ایڈیٹ! میں اور تم! دونوں ہی پاگل ہیں نا؟“

”ہاں۔“ وہ دھیرے سے ہنسی ”کسی شاعر نے بھی غالباً ہمارے لیے ہی کہا تھا۔“

ہم دونوں مستانوں میں ایک خواہش ملتی جلتی ہے
اس کو شہزادی ‘ مجھ کو شہزادے اچھے لگتے ہیں!

”صحیح کہا!“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”ہم نیویارک کیوں جا رہے ہیں؟“ کچھ دیر بعد وہ پوچھنے لگی۔

”ہم نیویارک کے آس پاس ہی کہیں جا رہے ہیں۔“

”مگر کہاں؟“

”ڈارک ہاربر۔“

”ڈارک ہاربر؟ مگر کیوں؟“

”تمہیں یاد ہے سمل! تم نے ایک دفعہ مجھ سے کہا کہ تمہارا ایک خواب ہے۔ کسی آئی لینڈ (جزیرہ) پر ایک گھر بنانے کا! میں نے تمہارے لیے ڈارک ہاربر میں ایک ولا لیا ہے۔ میں صرف تمہیں وہ دکھانا چاہتا ہوں۔ میں اللہ کے فضل سے اس قابل ہو ہی گیا ہوں کہ تمہیں تمہارے خواب کی تعبیر دے سکوں۔“

”خرم میں.....“ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

”نو مینشن!“ وہ فوراً“ بولا۔

نیویارک ایئرپورٹ پر وہ زیادہ دیر نہیں رکے۔ ایک خوب صورت Cessna طیارہ وہاں ان کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ دونوں اسی Cessna کے ذریعے Maine پہنچے۔

ساحل سمندر پر واقع تین منزلہ خوب صورت ولا دیکھ کر وہ جیسے مبہوت ہو گئی تھی۔ ولا کی چھت آف وائیٹ shingles سے ڈھکی ہوئی تھی جبکہ اطراف میں ایک خوب صورت باغیچہ سا بنا تھا جس میں ہر رنگ کے جنگلی گلاب‘ سوسن اور دیگر پھولوں کی بہتات تھی۔ گھر کے باہر سے اسے بارہ کھڑکیاں دکھائی دے رہی تھیں جن کے شٹر Rust کلر کے تھے۔ لان کے بیچ میں کریم کلر کی لان چیئرز رکھی تھیں جبکہ برآمدے میں دروازوں کے اطراف میں سفید بینچ پڑے تھے۔ ہر بینچ کے ساتھ سفید اور گلابی رنگ کے geranium کے پھولوں کا گملا رکھا تھا۔ سمل نے کئی خوب صورت ولا دیکھے تھے مگر اتنا حسین اور دلکش ولا اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

گھر کا اندرونی حصہ اور بھی سحر انگیز تھا۔ وسیع و عریض لونگ روم کی سمندر کی جانب گلاس وال تھی جس سے جھاگ اڑاتی لہریں سامنے نظر آ رہی تھیں۔ لونگ روم سے ہوتے ہوئے وہ ایک قدرے چھوٹے سٹنگ روم میں آ گئے جس کا آتشدان خوب صورتی میں اپنی مثال آپ تھا۔ وہ کچن میں آئی جو بالکل امریکن طرز کا بنا ہوا تھا۔ سمل کو پائن کی بنی ہوئی ورک ٹیبل بہت پسند آئی۔ کچن کے ساتھ ہی ایک کھلی سی پینٹری اور لانڈری روم تھا۔ پہلی منزل پر نوکروں کے لیے چھ بیڈ رومز تھے (جیسا کہ ہر بیچ ہاؤس میں ہوتا ہے) جبکہ دوسری اور تیسری منزل پر ماسٹر بیڈ رومز اور گیسٹ رومز تھے۔

”میں نے تمہارے لیے ایک چھوٹی سی لائبریری بھی بنوائی ہے۔“ خرم نے بتایا تو وہ پر تشکر نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔

اس چھوٹی سی لائبریری جس میں شاہ بلوط کی عمدہ لکڑی کا کام ہوا تھا‘ کا سائز جہانگیر پیلس میں موجود سمل کی لائبریری سے تین گنا زیادہ تھا۔

لائبریری سے نکل کر وہ دونوں ہال میں چلے آئے۔ اور اس وقت اس کے سامنے دیواروں پر نہایت سلیقے سے Van Rysselberghe سے لے کر De Smet تک کئی Belgian پینٹرز کی پینٹنگز آویزاں تھیں۔ سمل نے مڑ کر حیرانی سے خرم کو دیکھا۔ ایک دفعہ اس نے خرم کو بتایا تھا کہ اسے بیلجین آرٹ اور Cubist آرٹ سے بہت لگاؤ ہے۔ اسے حیرت تھی کہ خرم کو ابھی تک یاد تھا۔

راہداری میں لگی پینٹنگز دیکھ کر وہ مزید حیران ہوئی تھی۔ کیوبسٹ آرٹ! اس کا بہت زیادہ فیورٹ دیواروں پر Legers‘ Braques اور پکاسو کی آرٹ کولیکشن دیکھ کر سمل کو لگا وہ اپنے خواب کی دنیا میں آ گئی تھی۔ وہاں وہ سب تھا جو اسے پسند تھا۔

”آؤ میں تمہیں Yacht دکھاتا ہوں۔“

وہ اسے لے کر باہر آ گیا۔ رات ابھی تک گہری تھی۔ اسی لیے سمل کو وہ خوب صورت Yacht دیکھنے میں دقت ہو رہی تھی۔

”کتنا سائز ہے اس کا؟“

”ایک سو پچاس فٹ! اس میں چار GM ڈیزل ہیں‘ دو اسپیڈ بوٹس ہیں‘ ایک درجن لوگوں پر مشتمل عملہ‘ اس کے علاوہ ایک فریش واٹر سوئمنگ پول ہے..بس۔“

”بس!“ سمل نے دہرایا تو وہ ہنس پڑا۔

”اٹس آل فار یو سمل!“

”تھینک یو!“ وہ دھیرے سے بولی۔

کبھی یہی خواب تھا اس کا اور اس وقت وہ سوچ رہی تھی کہ اس کو اب خرم کی محبت چاہیے تھی۔

خرم کے ہاتھ میں ہاتھ دیے سمل نے اپنے اوپر ستاروں سے جگمگاتے سیاہ آسمان کی جانب دیکھا۔ کروڑوں برس پہلے چمکنے والے ان ستاروں پر نو سال‘ دو ماہ اور تئیس دن کی وہ داستان پہلے ہی لکھی جا چکی تھی۔

